Registered No. L. 5340

ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ :

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ پانچ روپے	براۓ پاکستان	قیمت فی پرچہ آٹھ آنے
،، سات روپیہ آٹھ آنے	براۓ ہندوستان	،، گیارہ آنے

فہرست مضامین

جلد ۲۸ | ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق فروری ۱۹۴۶ء | عدد ۳

اشارات	جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی	۲
تفہیم القرآن	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۳
مقالات		
موجودہ انتخابات اور جماعت اسلامی	جناب محمد عنایت اللہ صاحب وارثی	۳۳
جواب	ابوالاعلیٰ مودودی	۳۸
رسائل و مسائل		
بندوق کے شکار کی علت و حرمت	ابوالاعلیٰ مودودی	۵۲
تحقیق حدیث دجال	" "	۵۸
رد شبہات	" "	۶۰
اعلان اجتماع	قیم جماعت اسلامی	۶۴

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس، چمبرلین روڈ، لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام
پٹھان کوٹ (پنجاب) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

انبیائے کرام علیہم السلام جس طرح لوگوں کو مخاطب کرنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ترتیب تبلیغ و دعوت کی ایک بہت بڑی حکمت پر مبنی ہوتی ہے جو اس ترتیب کو الٹ دینے کی صورت میں، جیسا کہ ہم اس سلسلہ کی کئی پچھلی قسطوں میں بیان کر چکے ہیں، مفقود ہو جاتی ہے اسی طرح جن باتوں کو انبیائے کرام پیش کرتے ہیں ان کو پیش کرنے میں بھی وہ ایک خاص تدریج کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ تدریج بھی دعوتِ دین میں ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے، بلکہ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے الٹے دعوتِ دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تبلیغ دین کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے میں کیا ترتیب اختیار کی جائے اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی بیان کر دیں کہ دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کیا تدریج ملحوظ رکھی جائے۔

بظاہر تو یہ ایک واضح سی بات معلوم ہوتی ہے جس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہے حقیقت میں یہ عام طور پر مخفی اور اس کے مخفی ہونے ہی کی وجہ سے بسا اوقات لوگ ہم پر ایسے اعتراضات کر جاتے ہیں جن کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔ مثلاً بہت سے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہم توحید و رسالت کے اصولی مسائل پر جتنا زور دیتے ہیں اتنا لوگوں کی وضع قطع اسلامی بنانے پر زور نہیں دیتے۔ اور ہماری اسی بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان لباس، ڈاڑھی، وضع و ہیئت اور آداب زندگی میں اہلِ تقویٰ

متشرعین کے معیار پر نہیں ہیں بلکہ اس طرح کے امور میں ان میں عام طور پر غفلت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا گروہ ہم پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ تم لوگ اقامتِ دین کا مقصد لے کر اٹھے ہو تو صرف توحید اور رسالت کے وعظ پر کیوں قانع ہو گئے ہو!۔ تمام معاشرت و سیاست اور کاروبار میں اسلامی قوانین ہی کی پابندی کیوں نہیں کرتے؟ ہر حرام و ناجائز سے اجتناب کلی کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ اپنے اندر اسلامی حدود و تعزیرات کیوں نہیں جاری کرتے؟ طاغوت سے عملاً ٹکر لینے کے لیے سبقت کیوں نہیں کرتے؟ یہ اور اس قبیل کے بہت سے اعتراضات ہمارے مخالفین اور موافقین کی طرف سے اکثر آتے رہتے ہیں۔ مخالفین کی نکتہ چینیوں کو تو ہم زیادہ اہمیت نہیں دیتے کیونکہ یہ حضرات اس طرح کے اعتراضات محض اس لیے تراشتے رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی غلط زندگی کو صحیح ثابت کر دیں اور ہماری نسبت لوگوں میں کچھ بدگمانیاں پیدا کر دیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت بالکل وہی ہے جو حضرت مسیحؑ کے ان معترضین کی تھی جو ان کی دعوت کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ ان کے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے بھی کبھی کھانا کھا لیتے ہیں اور ان کے توحید کے وعظ پر یہ معارضہ کرتے تھے کہ قیصر کو خراج دینا چاہیے کہ نہیں؟ اس طرح کے نکتہ چینوں کا ایک گروہ ہر دعوتِ حق کے ساتھ جنم لیتا ہے اور اہل فتنہ کو فتنہ میں مبتلا رکھنے کے لیے اپنے "زخرف القول" کے جراثیم لوگوں میں پھیلاتا رہتا ہے۔ ان کے مقابل میں کسی داعی حق کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر کرے لیکن اسی طرح کے اعتراضات بسا اوقات ان لوگوں کی طرف سے بھی آتے ہیں جو ہمارے مقصد کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کام میں ان کا دلی تعاون ہمارے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے اعتراضات بدنیتی سے نہیں کرتے بلکہ فی الحقیقت وہ بعض اصولی باتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا صاف ہونا ضروری ہے۔

۱- پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہمارا صحیح موقف نہیں معلوم ہے۔ یہ ہم کو ایک بنی بنائی صالح جماعت کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بار سنبھالنے والی ایک جماعت تصور کرتے ہیں جس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے اندر جس گوشہ میں بھی کوئی فساد دیکھے بڑھکر اس کی اصلاح کرے

اور جو بات بھی خدا کے قانون کے خلاف پائے اس کو خدا کے قانون کے مطابق کر دے۔ حالانکہ ہماری حیثیت یہ نہیں ہے بلکہ ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر دین حق کی دعوت لے کر اٹھے ہیں جہاں نظام حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پر ایک مضبوط نظام باطل نے قائم ہو کر فضا میں اپنی شاخیں اور زمین میں دور تک اپنی جڑیں پھیلا دی ہیں۔ اس طرح کی جماعت کا طریق کار قدرتی طور پر سابق الذکر جماعت سے بالکل مختلف ہوگا اور جو لوگ دونوں کے فرق کو نہیں سمجھ رہے ہیں یا غلط فہمی سے دوسری کو پہلی جماعت سمجھ رہے ہیں ان کے ذہن میں التباس کی وجہ سے شبہات پیدا ہی ہوں گے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں اس امر کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے کہ ایک جماعت جو اس مقصد کے ساتھ اٹھی ہو کہ لوگوں کو ایک نظام باطل کے اندر سے کھینچ کھینچ کر نظام حق کی طرف لائے اس کو اپنے مقصد کو پیش کرنے میں تدریج اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ان کے نزدیک دین کا ہر کام یکساں اہمیت رکھتا ہے اور جس نقطہ سے بھی دین کی خدمت شروع کر دی جائے دین ہی کی خدمت ہے اور چونکہ اللہ کا پورا دین اترا ہوا، قرآن و حدیث کی صورت میں، لوگوں کے پاس موجود ہے اس وجہ سے یہ خواہش بھی پیدا ہوتی ہے کہ یک دفعہ پورا دین خود بھی اٹھا لیں اور دوسروں پر بھی لا دیں۔ نیز چونکہ ان لوگوں کا دینی تصور کچھ بلند نہیں ہے اس وجہ سے اجزائے دین میں سے ان چیزوں پر ان لوگوں کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے جو اگرچہ فلسفہ دین کے اعتبار سے کچھ ایسی اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن چونکہ ایک مدت سے وہ دیندارانہ زندگی کے نمایاں خط و خال سمجھ لیے گئے ہیں اس وجہ سے اصل دین سے ان کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ اس تدریج کو سمجھا جائے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی دعوت کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ چونکہ انبیاء کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوتی ہے جب نظام حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہوتا ہے اور ایک جاہلی نظام سوسائٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے

اس وجہ سے وہ سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت بلند کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ مبادی تین ہیں:۔

(۱) خدا پر ایمان، کامل توحید کے ساتھ۔

(۲) رسالت پر ایمان، کامل اطاعت کے ساتھ۔

(۳) آخرت پر ایمان، کامل تفویض کے ساتھ۔

یہی تین چیزیں ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی جاہلیت کی طرف کھسکنی شروع ہوتی ہے اور جب ان میں پوری طرح فساد رونما ہوجاتا ہے تو پوری سوسائٹی پر جاہلیت کی ظلمت چھا جاتی ہے اور انہی تینوں چیزوں کے آشکارا ہونے سے سوسائٹی اسلام کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے اور جب یہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں تو سوسائٹی پورے دن کی روشنی میں آجاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندر اتنا راسخ ہے کہ دنیا میں ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے لیکن چونکہ شیطان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ انہی چیزوں پر نظامِ حق کی بنیادیں قائم ہیں اس وجہ سے اس کی ساری کوشش ہمیشہ اس بات کے لیے رہی ہے کہ کسی طرح ان میں کوئی رخنہ ضرور پیدا کرے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے اسی طرح شیطان کی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ ان کا صحیح صحیح اقرار بھی بہت کم کیا گیا ہے۔ ان عقائد کے باب میں دنیا کی اصلی روش نہ انکار کی رہی ہے نہ ہمیشہ صاف صاف اقرار کی بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی رہی ہے اور یہی وہ گرہ ہے جو اس رشتہ میں بار بار پڑتی رہی ہے اور اسی کو کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیجا اور کتابیں نازل فرمائیں

اگر معاملہ ان کے انکار کا ہو تو چنداں مشکل نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر اتنی کشش رکھتے ہیں کہ تھوڑی سی جد و جہد سے تمام سلیم الفطرت انسانوں کے اندر ان کا اعتقاد پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن اس معاملہ میں دنیا نے انکار کی روش، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بہت کم اختیار کی ہے بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی روش اختیار کی ہے اور یہ اقرار مع الانکار دعوت و اصلاح کے راستہ کا وہ پتھر ہے جس کو

ہٹانے کے تصور سے ان لوگوں کا زہرہ آب ہوتا ہے جو اس کے ثقل سے بھی واقف ہیں اور ان سانپوں بچھوؤں اور اژدہوں سے بھی واقف ہیں جو اس کے جنبش میں آتے ہی اس کے نیچے سے سیلاب کے مانند ابل پڑتے ہیں اور ان لوگوں سے چمٹ جاتے ہیں جو اس پتھر کو کھسکانا چاہتے ہیں لیکن انبیائے کرام کو اور ان لوگوں کو جو دنیا کو راہ راست کی دعوت دیتے ہیں بالعموم ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جو باطل کو حق میں ملا کر اس کی پرستش کرتے ہیں اور خدا کے دین اور اپنے نفس کی خواہشوں میں مصالحت کرا کے ایک نیا نظام کھڑا کر لیتے ہیں اور اس کو پرانے نظام کا نام دے دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لیے چونکہ حق کو سپر بنائے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزا کو الگ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ ان کا ہر باطل حق بن کر رچ چکا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی جدائی ان کو اتنی شاق گذرتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت سے بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے، اس میں بڑی دیدہ ریزی، بڑے صبر، اور بڑے حلم کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہے کیونکہ جن لوگوں کے متعلق آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے. قدرتی طور پر ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا سارا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

بہرحال مذکورہ بالا بنیادی اصولوں کو مان کر جو لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں ان لوگوں کو انبیائے کرام ان باتوں کی تعلیم شروع کرتے ہیں جن سے ایک طرف تو وہ خدا سے بہتر سے بہتر طریق پر جڑ جائیں، دوسری طرف آپس میں بالکل مربوط ہو جائیں۔ یہ خدا اور بندوں سے ٹھیک ٹھیک جوڑ دینے والے اصول انہی تین اصولوں سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس وجہ سے ان لوگوں کو ان کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی جو ان تینوں اصولوں کو مان چکے ہوں۔ ایک شئے

کو مان لینے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس کے لوازم کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ ایک شے کے لوازم کی حیثیت تو درحقیقت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوتی ہے۔ لیکن اس تفصیل کو بھی انبیاے کرام مجرد اس اعتماد پر کہ جن لوگوں نے اصول تسلیم کر لیے ہیں وہ لازماً فروع کو بھی مان ہی لیں گے۔ یوں ہی کیف ما اتفق لوگوں کے سامنے پھینکنا نہیں شروع کر دیتے بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسی ترتیب و تدریج کے اندر ان کے مشن کی کامیابی کا اصل راز مضمر ہوتا ہے۔ اس ترتیب میں دو پہلو مدنظر ہوتے ہیں ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا، دوسرا جماعت کی اجتماعی استطاعت کا۔ یہ دونوں چیزیں کسی قدر وضاحت کی محتاج ہیں۔

ذہنی استعداد سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے۔ اس کے کچھ بنیادی کلیات ہیں، ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں، پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے اور دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ ایک بچہ کو پہلے حروف تہجی کی تعلیم دی جائے، پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے۔ پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ دی جائے۔ چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے جو اس کے اندر ملحوظ ہے اس وجہ سے ہر منزل میں اس نے آگے کی منزل کی استعداد بہم پہنچا لی ہے اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں ہوئی ہے بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرۃً فعل چاہتی ہے اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے بلکہ اس کے مختلف حصے اس کے سامنے بے ربط و بے ترتیب رکھ دیے گئے ہیں اس کی مثال بالکل اس بچہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزارے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو

جس کو وہ رٹ تو لے گا اور حافظہ کی مدد سے دہرا بھی سکے گا لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظہ پر ایک بار ہو گی۔ کبھی اس کی فطری استعداد کا جزو نہیں بن سکے گی۔ انبیائے کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں یہ طریقہ کبھی نہیں اختیار کرتے بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کو قبول کریں اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں اور پورا دین ان کے فکر و نظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے اسی چیز سے وہ رسوخ ایمان پیدا ہوتا ہے جو آروں سے چیرڈالے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا اور وہ ذوق تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روح دین کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا۔

جو لوگ دین کے اس نظام کو اور انبیائے کرام کے اس طریق دعوت کی خوبیوں کو نہیں سمجھے ہیں وہی لوگ ہیں جو معرفت الٰہی پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ صرف فرض نمازوں کا بلکہ تہجد و اشراق تک کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ جو نبی کی ضرورت اور اس کی اطاعت و پیروی کا اعتقاد پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کی داڑھیوں، لبوں اور پائجاموں کی پیمائش کرتے پھرتے ہیں، جو آخرت پر سچا اور پکا ایمان پیدا کرنے سے پہلے لوگوں پر خشیت، تقویٰ، تواضع اور فروتنی کا جمال دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان الٹی کوششوں سے ایک حد تک یہ ہو تو جاتا ہے کہ داڑھیاں لمبی ہو جاتی ہیں، ازاریں اپنے حد کے اندر آجاتی ہیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے ہر چیز میں ایک مصنوعی مسکینی نمایاں ہو جاتی ہے۔ کھانے پینے، کھانسنے اور چھینکنے ہر چیز میں پابندیٔ سنت کا التزام و اہتمام پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ غیر عقلی اور غیر فطری طریقہ پر پیدا کیا جاتا ہے اس وجہ سے اس تمام ہمہ تقویٰ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ "مچھر چھانے جاتے ہیں اور اونٹ نگلے جاتے ہیں"۔ اس طرح کے اتقیاء یہ نہیں دیکھتے کہ جو لقمہ حلق میں جا رہا ہے وہ پاک و طیب ہے یا طاغوت کی خدمت کر کے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس امر کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں کہ اس لقمہ حرام کو کھانے کے بعد پانی دہنے ہی ہاتھ سے پئیں۔ بائیں ہاتھ سے نہ پئیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا دینی تصور یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی "نیت خالص"

ہے تو وہ موجودہ نظام باطل کے اندر تھانہ داری، ڈپٹی کمشنری اور کونسلوں کی ممبری سب کچھ کرکے اللہ کو راضی اور اسلام کے جھنڈے کو اونچا کر سکتا ہے۔ انہی متقیوں کے اندر ہمیں ایسے لوگوں کا بھی پتہ ہے جو اپنی خوش قسمتی پر بہت نازاں ہیں کہ انھیں اپنی لڑکی کے لیے ایسا دیندار بر ملا ہے کہ اس کی ازار ٹخنوں سے کبھی نیچے نہیں ہوتی اور "فلاں حضرت" کا مرید ہے لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا ہے کوئی مسلمان حس ایمانی رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سارا بے تکاپن درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک مدت سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوت نہیں اٹھی جو ان کے سامنے ان کے پورے دین کو اس کے سسٹم کے ساتھ پیش کرتی اور تبلیغ و دعوت کے ہر مرحلہ میں دین کا جس قدر حصہ لوگوں کو دیتی اس کے پورے مقتضیات ان پر واضح کر دیتی بلکہ جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں کوئی کام شروع کیا، ضرورت کا شعور اور نظام دین کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جہاں سے چاہا شروع کر دیا اور جہاں چاہا ختم کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مسلمانوں کے اندر کچھ دینی شعور ہے اس قدر الٹا اور بے جان ہے کہ اس کو کسی صحیح دعوت کے لیے بنیاد بنانا تو درکنار اس کو قائم رکھ کر کوئی صحیح دعوت شاید شروع بھی نہیں کی جا سکتی۔

اب اسی طرح بالاجمال اُس اجتماعی استطاعت کی حقیقت پر غور کیجیے جس کو حضرات انبیائے کرام دین کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں۔ ایک انفرادی احکام دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں، اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی میں، ان کی تعمیل ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے۔ جب جماعت وجود میں آجائے تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی تعمیل کرے، مثلاً وہ احکام جو معاشرت و سیاست اور جہاد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کی تعلیم و دعوت میں افراد کے تحمل کا لحاظ ہوتا ہے کہ ان پر بارش کی طرح احکام برسا نہ دیے جائیں کہ وہ گھبرا کے سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اس کو

دیے جا رہے ہیں اُن کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس جماعتی استطاعت کا لحاظ نہایت ضروری بھی ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہایت مشکل بھی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو تو اس معاملہ میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے۔ کیونکہ احکام و قوانین نازل ہی جماعت کی قوت و استعداد کے لحاظ سے ہوتے ہیں، البتہ جو لوگ انبیاء کے طریقہ پر کسی جماعت کو اٹھانا چاہتے ہوں ان کو اس معاملہ میں سرتاسر اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک انھیں احکام دین کی ترتیب نزول، اپنے وقت کے خاص حالات، اور ایک نبی اور غیر نبی کی جماعت کے فرق کا پورا پورا اندازہ نہ ہو، کبھی ان کا قدم صحیح راہ پر نہیں پڑ سکتا اور ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس جماعت کی وہ قیادت کر رہے ہیں اس کی کشتی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی چٹان سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے:

جو لوگ اس امر سے واقف نہیں ہیں وہ پورے قرآن مجید کو اپنے سامنے دیکھکر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پورا کا پورا ایک ہی دن اتار دیا گیا تھا اور اس کے پورے کو ایک ہی دن میں جاری و نافذ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ جو جلد باز ہیں وہ ایک طرف توحید کی دعوت شروع کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظام قضا کی داغ بیل بھی ڈال دیتے ہیں۔ ایک طرف کفر بالطاغوت کی شرح شروع کرتے ہیں دوسری طرف طاغوت کو الٹی میٹم بھی بھیج دیتے ہیں۔ اور جو حضرات حیلہ باز ہیں اگر ان سے کہئے کہ غیر الٰہی نظام سے تعاون ناجائز ہے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ ریلیں کیوں استعمال کرتے ہو؟ ڈاک خانوں سے کیوں کام لیتے ہو؟ تار اور ٹیلیفون کا بائیکاٹ کیوں نہیں کرتے؟ اگر ان سے کہیے کہ ہندوستان دار الکفر ہے، اس کو دار الاسلام بنانے کی جد و جہد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، تو مطالبہ ہوگا کہ پھر یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کرتے اور کفار سے جنگ کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہے کہ کسی سرزمین کے نظام جاہلی کو نظام اسلامی سے بدل دینے کے لیے جو جد و جہد

اٹھتی ہے اس میں کیا ترتیب و تدریج ہے اور اس ترتیب و تدریج کے اندر کیا حکمتیں اور برکتیں ہیں۔ اور اس میں جماعت کی اجتماعی قدرت و استطاعت کا کس قدر صحیح اندازہ کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اس اندازہ میں ادنیٰ غلطی بھی ہو جائے تو کیا خطرے متصور ہیں؟

یہاں یہ بات بتانے کا موقع ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہے کہ قرآن میں معاشرت اور سیاست سے متعلق سارے احکام اس وقت نازل ہوئے ہیں جب کہ دارالاسلام بالفعل قائم ہو چکا ہے۔ اور ان احکام کے نازل ہونے میں بھی ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج جماعت کی استطاعت سے بالکل متوازی ہے۔ جب مسلمان اتنی تعداد میں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ایک علٰحدہ ہیئت اجتماعی کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انھیں ایک آزاد گوشہ زمین بھی مل جاتا ہے تب انھیں نظام کفر سے قطع تعلق کا آخری حکم دیا جاتا ہے۔ اس طرح جب مسلمانوں کی جماعتی قوت کم از کم اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر کے مقابل میں ٹک سکتے ہیں تب انھیں لڑائی کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب مسلمان اس حیثیت میں ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل نظام معاشرت و نظام معیشت کو چلا سکیں تب انھیں نظام کفر سے ہر طرح کے سوشل بائیکاٹ کا حکم دیا جاتا ہے اور اسلام کے وہ قوانین و احکام نازل ہوتے ہیں جو مدنی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ وقت آتا ہے کہ مسلمان وہ سیاسی قوت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ بغیر کسی اندیشہ مزاحمت خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو جاری و نافذ کر سکتے ہیں تو ان کو وہ احکام و قوانین دیے جاتے ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادی استعداد بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں ان کو سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی اس استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جو استعداد اس نے ایک مدت میں فراہم کی ہے وہ ساری

کی ساری برباد ہو جائے گی۔

یہ ساری تفصیل یہ سمجھانے کے لیے پیش کرنی پڑی ہے کہ آج جو دعوت ہم نے شروع کی ہے اس پر بعضوں کو تو یہ اعتراض ہے کہ اس میں سارا زور صرف اصولی مسائل پر ہے جزئیات دین کا اس میں خاص اہتمام نہیں ہے۔ اور دوسرا اعتراض بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ باوجود یہ جماعت مدعی ہے کہ طاغوت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون ناجائز ہے لیکن زندگی کے بہت سے گوشوں میں یہ بھی طاغوت کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے سامنے ہم یہ حقیقت لانا چاہتے ہیں کہ آج جو کام ہم کر رہے ہیں وہ کسی بنی بنائی جماعت کے اندر کسی جزوی فساد کی اصلاح کا کام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی سرزمین پر نظام حق کو از سر نو برپا کرنے کی دعوت ہے جہاں ایک نظام باطل پوری قوت کے ساتھ جما ہوا ہے۔ ایسی جگہ دعوت حق کا کام انجام دینے کے لیے حضرات انبیائے کرام نے جو نمونہ ہمارے واسطے چھوڑا ہے اس پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پروگرام میں اصولی طور پر دو چیزیں ملحوظ ہونی چاہئیں۔ ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا لحاظ، دوسری جماعت کی مادی استطاعت کا لحاظ۔ جب ان دونوں چیزوں میں متوازی اور تدریجی ترقی ہوتی ہے اور ان کی اس تدریجی ترقی ہی کے اعتبار سے ان پر ذمہ داریاں ڈالی جاتی ہیں تو جماعت کا صحیح ارتقاء وجود میں آتا ہے۔ ورنہ جماعت میں یا تو عقلی ضعف پیدا ہو جاتا ہے یا مادی یا دونوں طرح کا اور بالعموم دونوں ہی طرح کا ہوتا ہے کیونکہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔

تفہیم القرآن

(۳۶)

یونس

(از وسط رکوع ۸ تاختم سورہ)

پھر[1] ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا[2] اور وہ مجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔[3] موسیٰ نے کہا: تم حق کو یہ کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے

---

[1] اس موقع پر اُن حواشی کو پیش نظر رکھا جائے جو ہم نے سورہ اعراف (رکوع ۱۳ تا ۲۱) میں قصۂ موسیٰ وفرعون پر لکھے ہیں۔ جن امور کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے ان کا اعادہ یہاں نہ کیا جائے گا۔

[2] یعنی انھوں نے اپنی دولت وحکومت اور شوکت وحشمت کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھ لیا اور اطاعت میں سر جھکا دینے کے بجائے اکڑ دکھائی۔

[3] یعنی نبی کا پیغام سن کر وہی کچھ کہا جو کفار مکہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر کہا تھا کہ "یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے" (ملاحظہ ہو اسی سورۂ یونس کی دوسری آیت)۔

یہاں سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات صریح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ وہارون علیہم السلام بھی دراصل اُسی خدمت پر مامور ہوئے تھے جس پر حضرت نوح اور ان کے بعد کے تمام انبیاء، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک، مامور ہوتے رہے ہیں۔ اس سورہ میں ابتدا سے ایک ہی مضمون چلا آرہا ہے اور وہ یہ کہ صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رب اور الٰہ مانو اور یہ تسلیم کرو کہ تم کو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں اللہ کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔ پھر جو لوگ پیغمبر کی اس دعوت کو ماننے سے

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) انکار کر رہے تھے ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ نہ صرف تمہاری فلاح کا، بلکہ ہمیشہ سے تمام انسانوں کی فلاح کا انحصار اسی ایک بات پر رہا ہے کہ اس عقیدۂ توحید و آخرت کی دعوت کو، جسے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے، قبول کیا جائے اور اپنا پورا نظام زندگی اسی بنیاد پر قائم کر لیا جائے۔ فلاح صرف انھوں نے پائی جنھوں نے یہ کام کیا، اور جس قوم نے بھی اس سے انکار کیا وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی۔ یہی اس سورۃ کا مرکزی مضمون ہے، اور اس سیاق میں جب تاریخی نظائر کے طور پر دوسرے انبیاء کا ذکر آیا ہے تو لازماً اس کے یہی معنی ہیں کہ جو دعوت اس سورہ میں دی گئی ہے وہی ان تمام انبیاء کی دعوت تھی، اور اسی کو لے کر حضرت موسیٰ و ہارون بھی فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس گئے تھے۔ اگر واقعہ وہ ہوتا جو بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون کا مشن ایک خاص قوم کو دوسری قوم کی غلامی سے رہا کرانا تھا، تو اس سیاق و سباق میں اس واقعہ کو تاریخی نظیر کے طور پر پیش کرنا بالکل بے جوڑ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کے مشن کا ایک جزء یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل (ایک مسلمان قوم) کو ایک کافر قوم کے تسلط سے (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہے) نجات دلائیں لیکن یہ ایک ضمنی مقصد تھا نہ کہ اصل مقصد بعثت۔ اصل مقصد تو وہی تھا جو قرآن کی رو سے تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد رہا ہے، اور سورۂ نازعات میں اس کو صاف طور پر بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (فرعون کے پاس جا کیونکہ وہ حد بندگی سے گزر گیا ہے اور اس سے کہہ "کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ سدھر جائے اور میں تجھے تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو تو اس سے ڈرے؟")۔ چونکہ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا اور آخر کار حضرت موسیٰ کو یہی کرنا پڑا کہ اپنی مسلمان قوم کو اس کے تسلط سے نکال لے جائیں، اس لیے ان کے مشن کا یہی جزء تاریخ میں نمایاں ہو گیا اور قرآن میں بھی اس کو ویسا ہی نمایاں کر کے پیش کیا گیا جیسا کہ وہ تاریخ میں فی الواقع ہے۔ مگر جو شخص قرآن کی تفصیلات کو اس کے کلیات سے جدا کر کے دیکھنے کی غلطی نہ کرتا ہو، بلکہ انھیں کلیات کے تابع کر کے ہی دیکھتا اور سمجھتا ہو وہ کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ ایک قوم کی رہائی کسی نبی کی بعثت کا اصل مقصد اور دین حق کی دعوت محض ایک ضمنی مقصد ہو سکتی ہے۔

سامنے آگیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر فلاح نہیں پایا کرتے۔"[1] انھوں نے جواب میں کہا "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے؟[2] تمھاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں۔" اور فرعون نے (اپنے آدمیوں سے) کہا کہ "ہر ماہر فن جادوگر کو میرے پاس حاضر کرو" —— جب جادوگر آگئے تو موسیٰ نے ان سے کہا "جو کچھ تمھیں پھینکنا ہے پھینکو۔" پھر جب انھوں نے اپنے انجر پھینک دیے تو موسیٰ نے کہا "یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے یہ جادو ہے۔[3] اللہ ابھی اسے باطل کیے دیتا ہے، مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا، اور اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے

[1] مطلب یہ ہے کہ ظاہر نظر میں جادو اور معجزے کے درمیان جو مشابہت ہوتی ہے اس کی بنا پر تم لوگوں نے بے تکلف اِسے جادو قرار دے دیا۔ مگر نادانو! تم نے یہ نہ دیکھا کہ جادوگر کس سیرت و اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں اور کن مقاصد کے لیے جادوگری کیا کرتے ہیں۔ کیا کسی جادوگر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بے غرض اور بے دھڑک ایک جبار فرمانروا کے دربار میں آئے، اسے اس کی گمراہی پر سرزنش کرے اور اسے خدا پرستی اور طہارت نفس اختیار کرنے کی دعوت دے؟ تمھارے ہاں کوئی جادوگر آیا ہوتا تو پہلے درباریوں کے پاس خوشامدیں کرتا پھرتا کہ ذرا سرکار میں مجھے اپنے کمالات دکھانے کا موقع دلوا دو، پھر جب اسے دربار میں رسائی نصیب ہوتی تو عام خوشامدیوں سے بھی کچھ بڑھ کر ذلت کے ساتھ سلامیاں بجالاتا، چیخ چیخ کر درازی عمر و اقبال کی دعائیں دیتا، بڑی منت سماجت کے ساتھ درخواست کرتا کہ سرکار کچھ فدوی کے کمالات بھی ملاحظہ فرمائیں، اور جب تم اس کے تماشے دیکھ لیتے تو ہاتھ پھیلا دیتا کہ حضور کچھ انعام مل جائے —— اس پورے مضمون کو صرف ایک فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ جادوگر فلاح یافتہ انسان نہیں ہوا کرتے۔

[2] ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰ و ہارون کا اصل مطالبہ رہائی بنی اسرائیل کا ہوتا تو فرعون اور اس کے درباریوں کو یہ اندیشہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ ان دونوں بزرگوں کی دعوت پھیلنے سے سرزمین مصر کا دین بدل جائے گا اور ملک میں ہمارے بجائے اِن کی بڑائی قائم ہو جائے گی۔

[3] یعنی جادو وہ نہ تھا جو میں نے دکھایا تھا، جادو یہ ہے جو تم دکھا رہے ہو۔

خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

پھر دیکھو کہ موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں[۵] کے سوا کسی نے نہ مانا[۶]، فرعون کے

---

۵ متن میں لفظ ذُرِّیَّۃ استعمال ہوا ہے جس کے معنی اولاد کے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ "نوجوان" کیا ہے۔ مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو مفہوم قرآن مجید ادا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علمبردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ اُن کو خطرات سے پُر نظر آ رہا تھا، بلکہ وہ الٹے ان نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ کے قریب نہ جاؤ، ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

یہ بات خاص طور پر قرآن نے ... پیش کی ہے کہ مکّہ کی آبادی میں سے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقت اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم و ستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں ... کوئی بوڑھا کوئی نہ تھا، سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علی ابن ابی طالب، جعفر طیار، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، مصعب بن عُمیر، عبداللہ ابن مسعود جیسے لوگ قبول اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف، بلال، اور صہیب کی عمریں ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان تھیں۔ ابوعبیدہ بن الجراح، زید بن حارثہ، عثمان بن عفان اور عمر فاروق ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان عمر کے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابوبکر صدیق تھے اور ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔

۶ متن میں فما اٰمن لموسٰی کے الفاظ ہیں۔ اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید بنی اسرائیل سب کے سب کافر تھے اور ابتداءً ان میں سے صرف چند آدمی ایمان لائے۔ لیکن ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو وہ بالعموم اطاعت و انقیاد کے معنی دیتا ہے، یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہے پر چلنا۔ پس دراصل ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ موسیٰ کو اپنا

(باقی صفحہ ۲۷۱ پر)

ڈرے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رکتے نہیں ہیں۔[۱]

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ "لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر مسلمان ہو"۔[۲] انھوں نے جواب دیا[۳] "ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب! ہمیں ظالم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوت اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا۔ پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرزِ عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں موسیٰ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ، خصوصاً ان کے اکابر و اشراف موسیٰ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے امتی تھے اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن صدیوں کے اخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو زیردستی سے پیدا ہوئی تھی، ان میں اتنا بل بوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و ضلالت کی فرمانروائی کے مقابلہ میں ایمان و ہدایت کا علم لے کر خود اٹھتے۔ یا جو اٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] متن میں لفظ مسرفین استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمے سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مسرفین سے مراد در اصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مقاصد کے لیے کسی برے سے برے طریقے کو اختیار کرنے میں تامل نہیں کرتے، کسی ظلم اور کسی بد اخلاقی، اور کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چوکتے اور اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جا سکتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد نہیں جس پر جا کر وہ رک جائیں۔

[۲] ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کسی کافر قوم کو خطاب کر کے نہیں کہے جا سکتے تھے۔ حضرت موسیٰ کا یہ ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم اس وقت مسلمان تھی، اور حضرت موسیٰ ان کو یہ تلقین فرما رہے تھے کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرو۔

[۳] یہ جواب ان نوجوانوں کا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تھے یہاں قالوا کی ضمیر
(باقی صفحہ ۱۸ پر)

لوگوں کے لیے فتنہ[۵] نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) قوم کی طرف نہیں بلکہ ذریۃ کی طرف پھر رہی ہے، جیسا کہ سیاق کلام سے خود ظاہر ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵ ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ "ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا" بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔ گمراہی کے عام غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اٹھتے ہیں تو انھیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرمانروائی کے مقابلہ میں اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے کسی نہ کسی طرح درست ثابت کر دے اور ان لوگوں کو الٹا برسرِ باطل ثابت کر کے اپنے ضمیر کی اُس خلش کو مٹائے جو ان کی دعوتِ اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخرکار اسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلہ بھاری رہے، خواہ وہ حق ہو یا باطل۔ اس صورتِ حال میں ان داعیانِ حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہو گئے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا، اور آخر اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلف ہی کب کیا تھا، دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو ان عقائد و اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنۂ وقت نے دے رکھی تھی۔ تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ ٹھیک وہی ہے جو غالب رہا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں، یا مصائب و مشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے، بلکہ ان کے کسی فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صدور ہو جائے، تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں، اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدتہائے دراز تک کسی دوسری دعوتِ حق کے اٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ پس یہ بڑی معنی خیز دعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا ہم پر ایسا فضل فرما کہ

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ "مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرالو اور نماز قائم کرو[4] اور اہلِ ایمان کو بشارت دیدو"[5]۔
موسیٰ نے دعا کی[6] "اے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔ یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوریوں سے بچا اور ہماری سعی کو دنیا میں بارآور کردے، تاکہ ہمارا وجود تیری خلق کے لیے سببِ خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلۂ شر۔

(حواشی صفحہ ہذا) [4] اس آیت کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے، غور کرنے سے میں یہ سمجھا ہوں کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدد اور خود بنی اسرائیل کے اپنے ضعف ایمانی سے نماز باجماعت کا نظام ختم ہو چکا تھا، اور یہ ان کے شیرازے کے بکھرنے اور ان کی دینی روح پر موت طاری ہوجانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سرِ نو قائم کریں، اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لیے تعمیر یا تجویز کرلیں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جایا کرے۔ کیونکہ ایک بگڑی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی روح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سرِ نو مجتمع کرنے کے لیے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا پہلا قدم لازماً یہی ہوگا کہ اس میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے۔ ان مکانوں کو "قبلہ" ٹھیرانے کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لیے مرجع ٹھیرایا جائے، اور اس کے بعد ہی "نماز قائم کرو" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقرر مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں "اقامتِ صلوٰۃ" جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نماز باجماعت بھی شامل ہے۔

[5] یعنی اہلِ ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور پژمردگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دور کرو، انھیں پُر امید بناؤ، ان کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ۔ "بشارت دینے" کے مفہوم میں یہ سب معنی شامل ہیں۔

[6] اوپر کی آیات حضرت موسیٰ کی دعوت کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ دعا زمانۂ قیامِ مصر کے بالکل آخری زمانے کی ہے۔ بیچ میں تقریباً ۴۰ سال کا طویل فاصلہ ہے جس کی تفصیلات کو یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں اس بیچ کے دور کا بھی مفصل حال بیان ہوا ہے۔

زندگی میں زینت[1] اور اموال[2] سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب! ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔[3]" اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا "تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے[4]۔"

[1] یعنی ٹھاٹھ، شان و شوکت اور تمدن و تہذیب کی وہ خوشنمائی جس کی وجہ سے دنیا اُن پر اور ان کے طور طریقوں پر ریجھتی ہے اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ ویسا ہی بن جائے جیسے وہ ہیں۔

[2] یعنی ذرائع اور وسائل جن کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں رکھتے ہیں، اور جن کے فقدان کی وجہ سے اہل حق اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

[3] جیسا کہ ابھی ہم بتا چکے ہیں، یہ دعا حضرت موسیٰ نے زمانۂ قیام مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی تھی، اور اس وقت کی تھی جب پے در پے نشانات دیکھ لینے اور دین کی حجت پوری ہو جانے کے بعد بھی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت حق کی دشمنی پر انتہائی ہٹ دھرمی کے ساتھ جمے رہے۔ ایسے موقع پر پیغمبر جو بددعا کرتا ہے وہ ٹھیک ٹھیک وہی ہوتی ہے جو کفر پر اصرار کرنیوالوں کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، یعنی یہ کہ پھر انھیں ایمان کی توفیق نہ بخشی جائے۔

[4] جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے وہ باطل کے مقابلہ میں حق کی کمزوری، اور اقامتِ حق کے لیے سعی کرنیوالوں کی مسلسل ناکامیاں، اور ائمۂ باطل کے ٹھاٹھ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ اس کے باغی دنیا پر چھائے رہیں، اور شاید حضرت حق خود ہی باطل کے مقابلہ میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے۔ پھر وہ نادان لوگ آخر کار اپنی بدگمانیوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اُس ذرا سی دینداری پر راضی ہو کر بیٹھ رہا جائے جس کی اجازت کفر کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اور ان کے پیروؤں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ انہی ناموافق حالات میں کام کیے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گذار لے گئے، پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے ـــــ حتی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں"۔[۱] (جواب دیا گیا) "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت رہے[۲] اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں"۔[۳] ۹۰

ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا دیا[۴] اور نہایت عمدہ وسائل زندگی انہیں عطا کیے۔ پھر انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس وقت جب کہ علم ان کے پاس آچکا تھا۔[۵] یقیناً تیرا رب قیامت کے روز

---

[۱] بائبل میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مگر تلمود میں تصریح ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون نے کہا "میں تجھ پر ایمان لاتا ہوں، اے خداوند! تیرے سوا کوئی خدا نہیں"۔

[۲] آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجودہ زمانے میں جبل فرعون کہتے ہیں اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمام فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزنیمہ سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے، اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ ڈوبنے والا وہی فرعون منفتہ ہے جس کو زمانۂ حال کی تحقیق نے فرعون موسٰیؑ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سرگرافٹن ایلیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔

[۳] یعنی ہم تو سبق آموز اور عبرت انگیز نشانات دکھلائے ہی جائیں گے اگرچہ اکثر انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی بڑی سے بڑی عبرتناک نشانی کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

[۴] یعنی مصر سے نکلنے کے بعد ارض فلسطین میں۔

[۵] مطلب یہ ہے کہ بعد میں انہوں نے اپنے دین میں جو تفرقے برپا کیے اور نئے نئے مذہب نکالے اس کی وجہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ان کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اب اگر تجھے اُس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔[لہ] فی الواقع یہ تیرے پاس حق آیا ہے تیرے رب کی طرف سے لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا ہے، ورنہ تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آگیا ہے[لہ] ان کے سامنے خواہ کوئی نشانی آجائے وہ کبھی ایمان لاکر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی آخری وقت ایمان لائی ہو اور اُس کا ایمان اس کے لیے

(بقیہ صفحہ ۲) یہ نہیں تھی کہ ان کو حقیقت کا علم نہیں دیا گیا تھا اور وہ واقفیت کی بنا پر انھوں نے مجبوراً ایسا کیا، بلکہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔ خدا کی طرف سے تو انھیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ دین حق یہ ہے، یہ اس کے اصول ہیں، یہ اس کے تقاضے اور مطالبے ہیں، یہ کفر و دین کے امتیازی حدود ہیں، طاعت اس کو کہتے ہیں، معصیت اس کا نام ہے، ان چیزوں کی بازپرس خدا کے ہاں ہونی ہے، اور یہ وہ قواعد ہیں جن پر دنیا میں تمھاری زندگی قائم ہونی چاہیے۔ مگر ان صاف صاف ہدایتوں کے باوجود انھوں نے ایک دین کے بیسیوں دین بنا ڈالے، اور خدا کی دی ہوئی بنیادوں کو چھوڑ کر کچھ دوسری ہی بنیادوں پر مذاہب کی عمارتیں کھڑی کر لیں۔

(حواشی صفحہ ۲) لہ یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور اہل کتاب کا حوالہ اس لیے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، ان کے لیے یہ آواز ایک نئی آواز تھی، مگر اہل کتاب کے علماء میں سے جو لوگ متدین اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی دعوت تمام پچھلے انبیاء دیتے رہے ہیں۔

لہ یعنی یہ قول کہ جو لوگ خود طالب حق نہیں ہوتے، اور جو اپنے دلوں پر ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کے قفل چڑھائے رکھتے ہیں، اور جو دنیا کے عشق میں مدہوش اور عاقبت سے بے فکر ہوتے ہیں انھیں ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونس کی قوم[1] کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں)۔ وہ جب ایمان لے آئی تھی تو ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا[2] اور اس کو ایک مدت تک زندگی

[1] یونس علیہ السلام (جن کا نام بائیبل میں یوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸۶۰ء - ۷۸۴ء قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے) اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا اور اسی بنا پر اشوریوں کو یہاں قوم یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اس زمانہ میں نینوی کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں اور اسی علاقے میں "یونس نبی" کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت نینوی تقریباً ۶۰ میل کے دور میں پھیلا ہوا تھا۔

[2] قرآن میں اس قصہ کی طرف دو تین جگہ صرف اشارات کیے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قوم کن خاص وجوہ کی بنا پر خدا کے اس قانون سے مستثنیٰ کی گئی کہ عذاب کا فیصلہ ہوجانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ بائیبل میں "یوناہ" کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ اول تو نہ وہ آسمانی صحیفہ ہے، نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے، بلکہ ان کے بعد کسی نامعلوم زمانے میں کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخ یونس کے طور پر لکھ کر مجموعۂ کتب مقدسہ میں شامل کردیا ہے۔ دوسرے اس میں بعض صریح مہملات بھی پائے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں۔ تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونسؑ فریضۂ رسالت کی ادائگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور غالباً انھوں نے بے صبر ہوکر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا، اس لیے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کردیا۔ قرآن مجید میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کرلیتا۔ پس جب نبی نے ادائے رسالت میں کوتاہی کرگیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود اپنی جگہ سے ہٹ گیا، تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا کیونکہ اس پر اتمام حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں

سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیدیا تھا۔[۱۰۰]

اگر تیرے رب کی مشیت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن و فرمانبردار ہی ہوں) تو سارے اہل زمین ایمان لے آئے ہوتے۔[۱۰۱] پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟[۱۰۲] کوئی متنفس اللہ

---

۱۰۰ جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلتِ عمر میں اضافہ کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے پھر خیال و عمل کی گمراہیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ ناحوم نبی (۷۲۰ - ۶۹۸ قبل مسیح) نے اسے متنبہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر صفنیاہ نبی (۶۴۰ - ۶۰۹ قبل مسیح) نے اس کو آخری تنبیہ کی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار ۶۱۲ ق م کے لگ بھگ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مسلط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے اشور کے علاقے پر چڑھ آیا۔ اشوری فوج شکست کھا کر نینویٰ میں محصور ہو گئی۔ کچھ مدت تک اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پھر دجلے کی طغیانی نے فصیلِ شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے۔ پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد و پیش کے علاقے کا بھی یہی حشر ہوا۔ اشور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا اور اس کے ساتھ ہی اشوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

۱۰۱ یعنی اگر اللہ کی خواہش یہ ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اطاعت گزار و فرمانبردار ہی بسیں اور کفر و نافرمانی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو تو اس کے لیے نہ یہ مشکل تھا کہ وہ تمام اہل زمین کو مومن و مطیع پیدا کرتا، اور نہ یہی مشکل تھا کہ سب کے دل اپنے ایک ہی تکوینی اشارے سے ایمان و اطاعت کی طرف پھیر دیتا۔ مگر نوعِ انسانی کو پیدا کرنے میں جو حکیمانہ غرض اس کے پیشِ نظر ہے وہ اس تخلیقی و تکوینی جبر کے استعمال سے فوت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اللہ خود ہی انسانوں کو ایمان لانے یا نہ لانے اور اطاعت اختیار کرنے یا نہ کرنے میں آزاد رکھنا چاہتا ہے۔

۱۰۲ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ دراصل اس فقرے میں وہی اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں بکثرت مقامات پر ہمیں ملتا ہے کہ خطاب بظاہر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے مگر اصل میں لوگوں کو وہ بات سنانی مقصود ہوتی ہے جو نبی کو خطاب کر کے فرمائی جاتی ہے۔ یہاں جو کچھ کہنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ لوگو، حجت اور دلیل سے ہدایت و ضلالت

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا،[101] اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔[102]

ان سے کہو "زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو"۔ اور جو لوگ ایمان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۴) کا فرق کھول کر رکھ دینے اور راہ راست صاف صاف دکھا دینے کا جو حق تھا وہ تو ہمارے نبی نے پورا پورا ادا کر دیا ہے۔ اب اگر تم خود راست رو بننا نہیں چاہتے اور تمھارا سیدھی راہ پر آنا صرف اسی پر موقوف ہے کہ کوئی تمھیں زبردستی راہ راست پر لائے تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبی کے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا جبری ایمان اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے لیے اُسے نبی بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ کام تو وہ خود جب چاہتا کر سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [101] یعنی جس طرح تمام نعمتیں تنہا اللہ کے اختیار میں ہیں اور کوئی شخص کسی نعمت کو بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہ خود حاصل کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے شخص کو بخش سکتا ہے، اسی طرح یہ نعمت بھی کہ کوئی شخص صاحب ایمان ہو اور راہ راست کی طرف ہدایت پائے اللہ کے اذن پر منحصر ہے۔ کوئی شخص نہ اس نعمت کو اذن الٰہی کے بغیر خود پا سکتا ہے، اور نہ کسی انسان کے اختیار میں یہ ہے کہ جس کو چاہے یہ نعمت عطا کر دے۔ پس نبی اگر سچے دل سے یہ چاہے بھی کہ لوگوں کو مومن بنا دے تو نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے اللہ کا اذن اور اس کی توفیق درکار ہے۔

[102] یہاں صاف بتا دیا گیا کہ اللہ کا اذن اور اس کی توفیق کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے کہ بغیر کسی حکمت اور بغیر کسی معقول ضابطے کے یونہی جس کو چاہا نعمت ایمان پانے کا موقع دیا اور جسے چاہا اس موقع سے محروم کر دیا۔ بلکہ اس کا ایک نہایت حکیمانہ ضابطہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص حقیقت کی تلاش میں بے لاگ طریقے سے اپنی عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے اس کے لیے تو اللہ کی طرف سے حقیقت رسی کے اسباب و ذرائع اس کی سعی و طلب کے تناسب سے مہیا کر دیے جاتے ہیں، اور اسی کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق بخشی جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو طالب حق ہی نہیں ہیں، اور جو اپنی عقل کو تعصبات کے پھندوں میں پھانسے رکھتے ہیں یا سرے سے تلاش حقیقت میں اسے استعمال ہی نہیں کرتے، تو ان کے لیے اللہ کے خزانۂ قسمت میں جہالت اور گمراہی اور غلط بینی و غلط کاری کی نجاستوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی نجاستوں کا اہل بناتے ہیں، اور یہی ان کے نصیب میں لکھی جاتی ہیں۔

لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں۔[۱۰۵] اب یہ لوگ اس کے سوا اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی برے دن دیکھیں جو ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ ان سے کہو "اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔" پھر (جب ایسا وقت آتا ہے تو) ہم اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کو بچا لیں؟ ع ۱۰

اے نبی! کہدو کہ[۱۰۶] "لوگو! اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے

---

[۱۰۵] یہ ان کے اُس مطالبہ کا آخری اور قطعی جواب ہے جو وہ ایمان لانے کے لیے شرط کے طور پر پیش کرتے تھے کہ ہمیں کوئی نشانی دکھائی جائے جس سے ہم کو یقین آجائے کہ تمھاری نبوت سچی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تمھارے اندر حق کی طلب اور قبول حق کی آمادگی ہو تو وہ بے حد و حساب نشانیاں، جو زمین و آسمان میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، تمھیں پیغام محمدی کی صداقت کا اطمینان دلانے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں، صرف آنکھیں کھول کر انھیں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر یہ طلب اور یہ آمادگی ہی تمھارے اندر موجود نہیں ہے تو پھر کوئی نشانی بھی، خواہ وہ کیسی ہی خارق عادت اور عجیب و غریب ہو، تم کو نعمت ایمان سے بہرہ ور نہیں کر سکتی۔ ہر معجزے کو دیکھ کر تم فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرح کہو گے کہ یہ تو جادوگری ہے۔ اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان کی آنکھیں صرف اُس وقت کھلا کرتی ہیں جب خدا کا قہر و غضب اپنی ہولناک سخت گیری کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ جس طرح فرعون کی آنکھیں ڈوبتے وقت کھلی تھیں۔ مگر عین گرفتاری کے موقع پر جو توبہ کی جائے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

[۱۰۶] جس مضمون سے تقریر کی ابتدا کی گئی تھی، اسی پر اب تقریر کو ختم کیا جا رہا ہے۔ تقابل کے لیے پہلے رکوع کے مضمون پر پھر ایک نظر ڈال لی جائے۔

قبضے میں تمہاری زندگی و موت ہے[5]۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں
اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے[6]، اور

[5] متن میں لفظ یَتَوَفّٰکُمْ ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے "جو تمہیں موت دیتا ہے"۔ لیکن اس لفظی ترجمے سے اصل روح ظاہر نہیں ہوتی۔ اس ارشاد کی روح یہ ہے کہ "وہ جس کے قبضے میں تمہاری جان ہے، جو تم پر ایسا مکمل حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ جب تک اس کی مرضی ہو اسی وقت تک تم جی سکتے ہو اور جس وقت اس کا اشارہ ہو جائے اسی آن تمہیں اپنی جان اُس جان آفریں کے حوالے کر دینی پڑتی ہے، میں صرف اُسی کی پرستش اور اسی کی بندگی و غلامی اور اسی کی اطاعت و فرمانبرداری کا قائل ہوں"۔ یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ مشرکین مکہ بھی یہ مانتے تھے اور آج بھی ہر قسم کے مشرک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موت صرف اللہ رب العالمین کے اختیار میں ہے، اس پر کسی دوسرے کا قابو نہیں ہے، حتیٰ کہ اُن لوگوں میں سے بھی کوئی خود اپنی موت کا وقت نہیں ٹال سکا ہے جنھیں خدائی صفات و اختیارات میں شریک ٹھیرایا جاتا ہے۔ پس بیانِ مدعا کے لیے اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے کسی دوسری صفت کا ذکر کرنے کے بجائے یہ خاص صفت کہ "وہ جو تمہیں موت دیتا ہے" یہاں اس لیے انتخاب کی گئی ہے کہ اپنا مسلک بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح ہونے کی دلیل بھی دے دی جائے۔ یعنی سب کو چھوڑ کر میں اس کی بندگی اس لیے کرتا ہوں کہ زندگی و موت پر تنہا اسی کا اقتدار ہے، اور اس کے سوا دوسروں کی بندگی آخر کیوں کروں جب کہ وہ خود اپنی زندگی و موت پر بھی اقتدار نہیں رکھتے کجا کہ کسی اور کی زندگی و موت کے مختار ہوں۔ پھر کمالِ بلاغت یہ ہے کہ "وہ مجھے موت دینے والا ہے" کہنے کے بجائے "وہ جو تمہیں موت دیتا ہے" فرمایا۔ اس طرح ایک ہی لفظ میں بیانِ مدعا، دلیلِ مدعا، اور اپنے مدعا کی طرف دعوت، تینوں فائدے جمع کر دیے گئے ہیں۔ اگر یہ فرمایا جاتا کہ "میں اس کی بندگی کرتا ہوں جو مجھے موت دینے والا ہے" تو اس سے صرف یہی معنی نکلتے کہ "مجھے اس کی بندگی کرنی ہی چاہیے"۔ اب جو یہ فرمایا کہ "میں اس کی بندگی کرتا ہوں جو تمہیں موت دینے والا ہے" تو اس سے یہ معنی نکلے کہ مجھے ہی نہیں، تم کو بھی اسی کی بندگی کرنی چاہیے اور تم یہ غلطی کر رہے ہو کہ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کیے جاتے ہو۔

[6] اس مطالبے کی شدت قابلِ غور ہے۔ بات ان الفاظ میں بھی ادا ہو سکتی تھی کہ "تو اس دین کو اختیار کر لے"

(باقی صفحہ ۲۰۸ پر)

ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو۔ؔ اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان،
اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) یا "اس دین پر چل" یا "اس دین کا پیرو بن جا"۔ مگر اللہ تعالیٰ کو بیان کے یہ سب پیرایے ڈھیلے ڈھالے نظر آئے۔ اس دین کی جیسی سخت اور کھنچی اور کسی ہوئی پیروی مطلوب ہے اس کا اظہار ان کمزور الفاظ سے نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش فرمایا کہ "اقم وجھک للدین حنیفا"۔ اقم وجھک کے لفظی معنی ہیں "اپنا چہرا جما دے"۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تیرا رخ ایک ہی طرف قائم ہو، ڈگمگاتا اور ہٹتا ڈُلتا نہ ہو، کبھی پیچھے اور کبھی آگے اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں نہ مڑتا رہے، بالکل ناک کی سیدھ اُسی راستے پر نظر جمائے ہوئے چل جو تجھے دکھا دیا گیا ہے۔ یہ بندش بجائے خود بہت چست تھی، مگر اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا، اس پر ایک اور قید حنیفا کی بڑھائی گئی۔ حنیف اس کو کہتے ہیں جو سب طرف سے مُڑ کر ایک طرف کا ہو رہا ہو۔ پس مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کو، اس بندگی کے طریقے کو، اس طرز زندگی کو کہ پرستش، بندگی، غلامی، اطاعت، فرمانبرداری سب کچھ صرف اللہ رب العالمین ہی کی کی جائے، ایسی مضبوطی کے ساتھ اختیار کر کہ کسی دوسرے طریقے کی طرف ذرہ برابر میلان و رجحان بھی نہ ہو، اس راہ پر آکر اُن غلط راہوں سے کچھ بھی لگاؤ باقی نہ رہے جنھیں چھوڑ کر آیا ہے اور اُن ٹیڑھے راستوں پر ایک غلط انداز نگاہ بھی نہ پڑے جن پر دنیا چلی جا رہی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵ یعنی اُن لوگوں میں ہرگز شامل نہ ہو جو اللہ کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں اور اس کے اختیارات میں کسی طور پر غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں۔ خواہ وہ غیر اللہ ان کا اپنا نفس ہو، یا کوئی دوسرا انسان ہو، یا انسانوں کا کوئی مجموعہ ہو، یا روح ہو، جن ہو، فرشتہ ہو، یا کوئی مادی یا خیالی یا وہمی وجود ہو۔ پس مطالبہ صرف اس ایجابی صورت ہی میں نہیں ہے کہ توحید خالص کا راستہ پوری پوری استقامت کے ساتھ اختیار کر، بلکہ اس سلبی صورت میں بھی ہے کہ اُن لوگوں سے الگ ہو جا جو کسی شکل اور کسی ڈھنگ کا شرک کرتے ہوں۔ عقیدے ہی میں نہیں عمل میں بھی، انفرادی طرز زندگی ہی میں نہیں اجتماعی نظام حیات میں بھی، معبدوں اور پرستش گاہوں ہی میں نہیں درسگاہوں میں بھی، عدالت خانوں میں بھی، قانون سازی کی مجلسوں میں بھی، سیاست کے ایوانوں میں بھی، معیشت کے بازاروں میں بھی اُن لوگوں کے طریقے سے اپنا طریقہ الگ کر لے جنھوں نے

(باقی صفحہ ۲۹)

کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیر دینے والا بھی کوئی نہیں ہے؎۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اے محمدؐ! کہدو کہ "لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اُس کی راست روی اُسی کے لیے مفید ہے اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کن ہے۔" اور اے نبیؐ! تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجی جارہی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے؎۔ ع۱۱

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۸) اپنے افکار و اعمال کا پورا نظام خدا پرستی اور ناخدا پرستی کی آمیزش پر قائم کر رکھا ہے۔ کیونکہ توحید کا پیرو زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے میں بھی شرک کی راہ چلنے والوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتا (کجا کہ آگے وہ ہوں اور پیچھے یہ اور پھر بھی اس کی توحید پرستی کے تقاضے اطمینان سے پورے ہوتے رہیں!) پھر مطالبہ شرکِ جلی ہی سے پرہیز کا نہیں ہے بلکہ شرکِ خفی سے بھی کامل اور سخت اجتناب کا ہے، بلکہ شرکِ خفی زیادہ خوفناک ہے اور اس سے ہوشیار رہنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ بعض نادان لوگ "شرکِ خفی" کو "شرکِ خفیف" سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ اس کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا شرکِ جلی کا ہے۔ حالانکہ خفی کے معنی خفیف کے نہیں ہیں، پوشیدہ و مستور کے ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو دشمن منہ کھول کر دن دھاڑے سامنے آجائے وہ زیادہ خطرناک ہے یا وہ جو آستین میں چھپا ہوا ہو یا دوست کے لباس میں معانقہ کر رہا ہو؟ بیماری وہ زیادہ مہلک ہے جس کی علامات بالکل نمایاں ہوں یا وہ جو مدتوں تک تندرستی کے دھوکے میں رکھ کر اندر ہی اندر صحت کی جڑ کھوکھلی کر رہی ہو؟ جس شرک کو ہر شخص بیک نظر دیکھ کر کہدے کہ یہ شرک ہے اس سے تو دینِ توحید کا تصادم بالکل کھلا ہوا ہے، مگر جس شرک کو سمجھنے کے لیے گہری نگاہ اور مقتضیاتِ توحید کا عمیق فہم درکار ہے، وہ اپنی غیر مرئی جڑیں دین کے نظام میں اس طرح پھیلاتا ہے کہ عام اہلِ توحید کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی اور رفتہ رفتہ ایسے غیر محسوس طریقے سے دین کے مغز کو کھا جاتا ہے کہ کہیں خطرے کا الارم بجنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) ؎ یعنی نہ دشمنانِ حق کی دھمکیوں کا خوف کھا اور نہ ان کی عنایتوں کا لالچ دل میں رکھ۔ تیرا خوف اللہ ہی کا ہو، تیری امید سب کچھ اللہ سے وابستہ رہے اور اسی کے اعتماد پر تو اللہ کا کام کیے جا۔

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

از

افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترجمہ جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

(۵)

مسئلۂ اجتہاد

اجتہادِ مطلق کی شرائط جاننا چاہیے کہ مجتہد مطلق وہ شخص ہوتا ہے جو پانچ علوم پر (جن کی تصریح آگے آتی ہے) دسترس رکھتا ہو۔ چنانچہ امام نووی اپنی کتاب "منہاج" میں لکھتے ہیں:۔

"قاضی ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ آدمی مسلمان ہو، عاقل اور بالغ ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عادل ہو، سماعت اور بصارت اور گویائی کی قوتوں سے پوری طرح بہرہ مند ہو اور (آخر میں یہ کہ) مجتہد ہو۔

مجتہد ہونے کا معیار یہ ہے کہ:۔ (۱) وہ کتاب وسنت کے ان حصوں پر جن کا تعلق احکام سے ہے، گہری نظر رکھتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ ان کے اندر کون سے نصوص خاص ہیں اور کون سے عام؟ کون نص مجمل ہے اور کون مبین؟ کون حکم ناسخ ہے اور کون منسوخ؟ (۲) (روایتی حیثیت سے) احادیث کے متعلق یہ علم رکھتا ہو کہ کون کون سی حدیثیں متواتر ہیں، اور کون احاد؟ کون حدیث متصل ہے اور کون مرسل؟ نیز یہ کہ کون راوی کس درجہ میں قوی یا ضعیف ہے؟ (۳) زبان عربی پر لغوی اور نحوی دونوں حیثیتوں سے عبور رکھتا ہو۔ (۴) علمائے صحابہ وتابعین وغیرہم کے اقوال کی بابت اس راز سے باخبر ہو کہ کون مسئلہ اجماعی ہے اور کون اختلافی؟ (۵) قیاس کی حقیقت

اور اس کی تمام اقسام کو جانتا ہو"۔

مجتہدین مطلق کی اقسام اجتہاد مطلق کی شرائط جان لینے کے بعد دوسری چیز معلوم کرنے کی یہ ہے کہ مجتہد مطلق دو طرح کے ہوتے ہیں، "مطلق مستقل" اور "مطلق منتسب"۔

مجتہد مطلق مستقل اور اس کی خصوصیات مستقل مجتہد وہ ہوتا ہے جس کے اندر حسب ذیل تین باتیں ایسے مخصوص رنگ کی پائی جائیں جو اس کو باقی تمام ارباب اجتہاد سے ممتاز کرتی ہوں، چنانچہ امام شافعی کے اندر تم ان صفات کو نمایاں طور پر محسوس کر سکتے ہو:

(۱) پہلی بات یہ کہ اُن اصول و قواعد میں، جن کے مطابق فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے، وہ بطور خود تصرف[1] کرے۔ امام شافعی نے اپنی مشہور تصنیف "اَلاُم" کے ابتدائی صفحات میں اس حقیقت کو اچھی طرح بے حجاب کر دیا ہے، جہاں انھوں نے اپنے پیشرو علماء کے کارنامۂ استنباط (و طریق اجتہاد) کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بعض اصولوں پر مخالفانہ تنقید کی ہے۔ نیز اس حقیقت کی شہادت امام موصوف کے اس قول سے بھی ملتی ہے جس کو مجھ سے میرے استاذ شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم مدنی نے، اور انھوں نے اپنے دو مکی شیوخ، شیخ حسن بن علی عُجَیمی اور شیخ احمد نخلی سے، اور ان دونوں بزرگوں نے شیخ محمد علاء بابلی سے، اور انھوں نے شیخ ابراہیم بن ابراہیم لقانی اور عبدالرؤف طبلاوی سے، اور ان دونوں حضرات نے جلال ابو الفضل سیوطی سے، اور انھوں نے ابو الفضل مرجانی سے ـــــ بطور اجازت[2] ـــــ اور انھوں نے ابو الفرج غزنی سے، اور انھوں نے یونس بن ابراہیم دبوسی سے، اور انھوں نے ابو الحسن بن مقیر سے، اور انھوں نے فضل بن سہل اسفرائنی سے، اور انھوں نے حافظ حجت[3] ابو بکر احمد بن علی خطیب سے،

---

[1] "تصرف" کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے مجتہدین نے اجتہاد و استنباط کے جو اصول مقرر کیے ہیں ان کو جوں کا توں قبول نہ کرلے، بلکہ اپنے طور پر ان میں ترمیم و تغیر کرے، اور اپنا ایک مستقل دستور اجتہاد ترتیب دے لے۔

[2] علمائے اصولِ حدیث کی زبان میں اجازت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شیخ اپنے شاگرد کو کسی لکھی ہوئی حدیث نہ روایت کرنے کی اجازت دے دے، خواہ زبانی طور پر یا تحریری طور پر۔

[3] "حافظ" سے مراد حافظ حدیث ہے۔ اور "حجت" الفاظ تعدیل میں سے ایک لفظ ہے۔

(مترجم)

اور انھوں نے حافظ ابو نعیم سے، اور انھوں نے ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن جعفر بن حدان سے، اور انھوں نے عبد اللہ بن محمد بن یعقوب سے، اور انھوں نے ابو حاتم یعنی رازی سے، اور انھوں نے یونس بن عبد الاعلیٰ سے۔ اور یونس بن عبد الاعلیٰ نے محمد بن ادریس یعنی خود امام شافعی سے نقل کیا کہ امام موصوف نے فرمایا:۔

"اصل (سرچشمۂ ہدایت) قرآن اور سنت ہیں۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں یہ دونوں خاموش ہوں تو ان (کے اصول اور نصوص صریحہ) کو سامنے رکھ کر قیاس کرنا چاہیے۔ اور (سنت کے متعلق اصول یہ ہے کہ) اگر کسی روایت کی سند اتصال کے ساتھ رسول اللہ صلعم تک پہنچتی ہو اور صحیح بھی ہو تو وہ سنت ہے۔ لیکن خبر مفرد کے مقابلہ میں اجماع زیادہ وزنی شے ہے۔ پھر (حدیث کا مطلب بیان کرنے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ تا حد امکان) اس کا ظاہری (اور متبادر) مفہوم لیا جائے، اور اگر ایک حدیث بہت سے معانی کا احتمال رکھتی ہو تو وہی معنی لینا زیادہ مناسب ہے جو حدیث کے ظاہری پہلو سے قریب تر ہو، اور اگر بہت سی حدیثیں ہم پلہ (اور باہم متعارض) ہوں تو سزاوار ترجیح وہ حدیث ہوگی جس کی سند سب سے زیادہ مضبوط ہو۔ (حجیت شرعی کی ترازو میں) منقطع حدیث کوئی وزن نہیں رکھتی، سوائے سعید ابن مسیب کی منقطع حدیثوں کے۔ کسی اصل (شرعی) کو کسی دوسری اصل پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، نہ کسی اصل کے بارے میں "کیوں" اور "کس طرح" کا سوال اٹھانا چاہیے۔ اس طرح کے سوالات صرف فروع میں اٹھائے جا سکتے ہیں (اور قیاس کی احتیاج بھی فروع ہی کو ہوتی ہے)، سو اگر (تحقیق کی نگاہ میں) کسی اصل پر کسی فرع کا قیاس صحیح اترتا ہو تو وہ فرع صحیح اور قابل حجت تسلیم ہوگی"۔

(۲) دوسری چیز یہ ہے کہ وہ مجتہد (ممکن حد تک) احادیث اور آثار کا ذخیرہ جمع کرلے اور ان کے احکام اپنے دائرۂ معلومات میں اچھی طرح سمیٹ لے۔ اس کو اس امر کا پورا پتہ ہو کہ کون کون سی حدیثیں فقہ کا ماخذ ہیں۔ پھر یہ کہ وہ مختلف روایات میں باہم تطبیق، اور ایک حدیث کو دوسری پر (دلائل کے ساتھ) ترجیح دے سکے۔ اور (اگر کسی حدیث کے کئی ایک معانی ہو سکتے ہوں تو) ایک

مفہوم کی تعیین کرسکے۔ (علمی نقطۂ نظر سے یہ استعداد اتنی بلند پایہ ہے کہ) ہمارے خیال میں یہ تنہا امام شافعی (جیسے جلیل القدر امام و مجتہد) کے قریباً دو تہائی سرمایۂ علمی کے برابر ہے۔

(۳) تیسری چیز یہ ہے کہ وہ ان نئے نئے فروعی مسائل کا اپنے اجتہاد اور استنباط سے جواب دے جو اس کے سامنے لائے جائیں اور جن کا اس سے پہلے، یعنی ان تینوں زمانوں میں جن کے سراپا خیر و برکت ہونے پر زبان رسالت گواہی دے چکی ہے، جواب نہ دیا گیا ہو۔

الغرض ان تینوں امور میں وہ نمایاں حد تک تصرف رکھتا ہو اور اس معاملہ میں اپنے ہم سروں سے فائق، اور میدان مسابقت میں پیچھے چھوڑ کر کافی آگے نکل گیا ہو۔

ان سہ گانہ صفات کے بعد، انہی سے لگی ہوئی، ایک صفت خاص اور بھی ہے (جس سے ایک مجتہد مستقل سرفراز ہوتا ہے) اور وہ یہ کہ عالم بالا سے اس مجتہد کے لیے قبول عام کا نزول ہو (اور وہ اس شکل میں) کہ مفسرین، محدثین، علمائے اصول اور حفاظ کتب فقہ، گروہ کے گروہ، اس کے علم کی طرف جھک پڑیں، اور اس قبول عام اور مرجعیت انام پر مدتوں کی مدتیں گزر جائیں، یہاں تک کہ دلوں کے عمیق ترین گوشوں میں یہ حسن عقیدت مضبوطی سے اپنی جڑیں پھیلالے۔

مجتہد مطلق منتسب

مجتہد منتسب اس مجتہد کو کہتے ہیں جو (مذکورہ بالا تینوں صفات میں سے) پہلی صفت میں بجائے خود کوئی اپنا مستقل مقام نہ رکھتا ہو بلکہ کسی مجتہد مستقل کا پیرو ہو اور (اصول اجتہاد میں تصرف کرنے اور اپنی صوابدید سے اصول و ضوابط مرتب کرنے کے بجائے) اسی کے مقرر کیے ہوئے اصولوں کو جوں کا توں مان لیتا ہو۔ مگر دوسری اور تیسری صفت سے خود بھی متصف ہو، اور (ان امور میں اس کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے) اسی کی طرح خود بھی اپنے مستقل کارنامے رکھتا ہو۔

مجتہد فی المذاہب

(یہ دو قسمیں تو ان مجتہدین کی تھیں جن کو اجتہاد مطلق کا مرتبہ حاصل ہو، لیکن وہ شخص جو اس مرتبہ سے فروتر ہو لیکن اس کے باوجود شان اجتہاد رکھتا ہو اس کو مجتہد فی المذہب کہتے ہیں یعنی) وہ مجتہد جو پہلے اور دوسرے دونوں امور میں امام مجتہد مستقل (کے اقوال و نظریات اور اس کی تحقیقات) کا پابند رہتا ہے اور صرف تیسرے امر میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے، یعنی امام مجتہد کے طریق تفریع پر خود

بھی مسائل کا استنباط کرتا ہے۔

آؤ، ہم ایک مثال دیں (تاکہ یہ مسئلہ اچھی طرح بے نقاب ہو جائے):

آج کل جو شخص طبابت کے میدان میں قدم رکھتا ہے وہ یا تو اطبائے یونان کی رہنمائی میں فرائض طبابت انجام دیتا ہے یا پھر اطبائے ہند کی رہنمائی میں۔ تو اُن پرانے اطبائے یونان و ہند کو بمنزلہ مجتہد مستقل کے سمجھو۔ (رہا یہ شخص، تو اس کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں) اگر وہ دواؤں کے خواص اور بیماریوں کی اقسام اور شربتوں اور معجونوں کے بنانے کی ترکیبوں سے پوری بصیرت کے ساتھ واقفیت رکھتا ہو ـــــ اور وہ اس طرح کہ اس سلسلہ میں اطبائے قدیم نے جو کچھ ہدایتیں دی ہیں ان پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس فن کا خود رمز شناس ہو چکا ہو، یہاں تک کہ (اس کے اصول و نظریات اور اسرار و حقائق کا) تقلیدی طور پر نہیں بلکہ براہ راست علم یقین حاصل کر چکا ہو ـــــ نیز اگر وہ انہی اطبا کی طرح خود بھی فنی کارنامے سرانجام دینے پر قدرت رکھتا ہو، یعنی یہ کہ ایسی دواؤں کے خواص معلوم کرے جن کے تذکرے سے اب تک کا پورا طبی لٹریچر خالی ہو، اور امراض کے ایسے اسباب اور علامات اور معالجات کا انکشاف کرے جن کی اب تک کسی طبیب نے نشاندہی نہ کی ہو، اور اگر وہ پرانے اطبا کی رایوں سے اختلاف بھی کرتا ہو (اور ان کو غلط ثابت کر کے ان کے مقابلے میں اپنی رائیں پیش کرتا ہو)، خواہ یہ مخالفت چند ایک رایوں تک محدود ہو یا وسیع پیمانے پر ہو، تو ایسا طبیب بمنزلہ "مجتہد مطلق منتسب" کے ہے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف وہ ان تمام امور متعلقہ علم طب کو بغیر یقین کامل کے محض پچھلے اطبا کے کہنے کی وجہ سے مان لیتا ہے اور اس کے فکر و عمل کی سب سے اونچی معراج یہ ہوتی ہے کہ انہی کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق شربت اور معجون بنایا کرتا ہے، جیسا کہ آج کل کے اکثر طبابت پیشہ حضرات کا حال ہے، تو ایسے طبیب کی حیثیت "مجتہد فی المذہب" کی سی ہے۔

اسی طرح (ایک دوسری مثال لو۔) آج کل جو شخص بھی شعر کہتا ہے وہ فن شعر گوئی میں یا تو شعرائے عرب کی اقتدا کرتا اور ان کے اوزان و قوافی و اسالیب قصیدہ گوئی کو اختیار کرتا ہے، یا پھر

شعرائے عجم کی پیروی کرتا ہے۔ تو یہ شعرائے عرب و عجم بمنزلہ "مجتہد مستقل" کے ہیں۔ رہا یہ شاعر، تو اگر وہ (ان کی قائم کی ہوئی حدود میں ہی اپنی جولانی فکر کو مقید نہیں رکھتا بلکہ خود بھی) غزل، تشبیب، مدح، ہجو اور نصیحت (وغیرہ اصناف) شعر کی نئی نئی قسمیں ایجاد کرتا ہو، اور استعارات اور بدائع کا استعمال ایسے اچھوتے انداز سے کرتا ہو جس کی طرف ابھی تک کسی کا مرغ تخیل پرواز نہ کر سکا ہو بلکہ شعرائے قدیم کی بعض صنائع شعری کو دیکھ کر اس کا ذہن خود بخود اس طرف منتقل ہوا ہو اور اس نے ایک چیز کو اس کی مشابہ چیز پر ڈھال لیا ہو یا ایک شئے کو دوسری شے پر قیاس کر لیا ہو، پھر یہ کہ وہ کوئی ایسی بحر ایجاد کر سکا ہو جس میں اب تک کوئی نظم نہ کہی گئی ہو، یا دنیائے شعر و شاعری میں سخن گوئی کی کوئی نئی طرح ڈال گیا ہو، مثلاً مثنوی یا رباعی کا لکھنا یا ردیف کا التزام کرنا، یعنی کسی ایک ہی لفظ یا ایک سے زائد الفاظ کو ہر شعر میں قافیہ کے بعد لاتے رہنا، تو ــــ بشرطیکہ یہ باتیں عربی شاعری میں کی گئی ہوں ــــ ایسا شاعر (گویا عربی شاعری کا) "مجتہد مطلق منتسب" ہو گا۔ لیکن اگر یہ شاعر ایجاد و اختراع کے کارنامے نہیں رکھتا اور صرف ان پرانے شعراء کی بنائی ہوئی روشوں ہی پر چلا جا رہا ہے تو اس کا مقام "مجتہد فی المذہب" کا سا ہو گا۔ انہی مثالوں پر علم تفسیر اور علم تصوف و دیگر علوم (کے ماہرین) کو بھی قیاس کر لو۔

سلف نے اصول فقہ کی تدوین کیوں نہ کی؟

اس جگہ اگر تم یہ سوال کرو کہ ابتدائی دور کے علما نے اصول فقہ کے متعلق کوئی خاص اور تفصیلی گفتگو نہیں کی، یہاں تک کہ امام شافعی عالم ظہور میں آئے تو انھوں نے اس فن پر سیر حاصل، مفید اور پرمغز بحثیں کیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ علمائے سلف میں سے ہر ایک کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ سب کا سب صرف اس کے اپنے ہی شہر والوں کی بیان کردہ احادیث و آثار پر مشتمل تھا، تمام بلاد اسلامیہ میں پھیلی ہوئی روایتیں کسی کے پاس اکٹھی جمع نہ تھیں (اس لیے ان کو کسی بڑے پیمانہ پر مختلف اور متعارض روایات کی الجھنیں دور کرنے کی زحمتیں نہیں اٹھانی پڑتی تھیں، اور) اگر کبھی ایسا ہوتا کہ اس کے شہر کی روایتیں ہی متعارض ہوتیں جس کے باعث ایک مسئلہ کی دلیلوں میں تعارض واقع ہو جاتا تو (کسی مرتب اور متعین ضابطہ کے بجائے) وہ صرف اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے اس تعارض کا جو فیصلہ بن پڑتا، کر لیتا تھا

اس کے بعد امام شافعی کے زمانہ میں (جب صورت حالات بدل گئی اور) تمام اطراف کی حدیثیں اکٹھی جمع ہوگئیں تو ان مختلف مقامات کی حدیثوں اور پھر وہاں کے فقہا کی رایوں میں (شدید قسم کا) تعارض واقع ہو (اور وہ تعارض بھی ایسا) جو دوگونہ تھا۔ ایک تو وہ تعارض جو ایک مقام کی روایتوں اور دوسرے مقام کی روایتوں میں تھا، دوسرا وہ جو ایک ہی مقام کی مختلف روایتوں میں تھا۔ اور (اس پہ مزید ستم یہ ہوا کہ) بلا استثنا، تمام لوگوں نے اپنے اپنے شیوخ کی رایوں کی، جن کو انھوں نے اپنی اپنی فہم کے مطابق اختیار کیا تھا، حمایت شروع کردی۔ انجام کار اختلاف کا رخنہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا اور ملت کی پراگندگی حد سے تجاوز کرگئی اور اس کو اتنے اختلافات کے طوفان نے آن گھیرا جن کا کوئی شمار نہ تھا۔ لوگ اس طوفان کے زغہ میں حیران و ششدر کھڑے تھے اور اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے تھے۔ یہاں تک کہ نصرت الٰہی نے آکر ان کی دست گیری کی اور امام شافعیؒ کے دل میں کچھ ایسے اصول و قواعد الہام فرمائے گئے جن کے ذریعہ انھوں نے مختلف اور متعارض حدیثوں میں تطبیق دے کے (اس طوفان اختلاف کو روک دیا اور) اپنے بعد والوں کے سامنے ایک عجیب و غریب راہ کھولدی۔

مذاہب چہارگانہ کی تاریخ اجتہاد تیسری صدی ہجری کے بعد امام ابوحنیفہ کے مذہب میں "مجتہدین مطلق منتسب" کے ظہور کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ علمائے احناف ہمیشہ سے علم حدیث کے ساتھ وابستگی کم رکھتے رہے ہیں، اور کوئی شخص مجتہد مطلق منتسب ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ ایک متبحر عالم حدیث نہ ہو۔ پس (تیسری صدی کے بعد) اس مذہب میں صرف مجتہد فی المذہب ہی ہوا کیے ہیں۔ اور اسی اجتہاد فی المذہب ہی کی طرف اشارہ تھا اس شخص کا جس نے یہ کہا تھا کہ مجتہد ہونے کی کم سے کم شرط یہ ہے کہ مبسوط یاد ہو۔

مذہب مالکی میں بھی "مجتہد مطلق منتسب" بہت کم ہوئے ہیں، اور جو لوگ اس مقام کو پہنچے بھی ان کی جداگانہ اجتہادی رائیں مذہب مالکی کے اقوال شمار نہیں ہوتیں، مثلاً قاضی ابوبکر ابن عربی اور علامہ ابوعمر، جو ابن عبدالبر کے نام سے مشہور ہیں۔

رہا مذہب حنبلی، تو اس کا پھیلاؤ پہلے بھی کچھ زیادہ نہ تھا اور نہ اب اس وقت ہے (لیکن اس کے

باوجود یہ ایک امر واقعی ہے کہ) اس مذہب کے اندر برابر ہر دور میں مجتہد پیدا ہوتے رہے اور یہ سلسلہ نویں صدی ہجری تک پہنچ کر ختم ہوا۔ اور (پھر یہی وہ وقت ہے جب کہ) اکثر مقامات میں اس کے اقتدار کی جڑیں ہل گئیں (اور انجام کار وہ وہاں سے ناپید ہو گیا) ہاں مصر و بغداد میں ابھی کچھ پیرو اس کے ضرور موجود ہیں، مگر بہت تھوڑے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کو مذہب شافعی سے وہی نسبت ہے جو امام ابو یوسف اور امام محمد کے مذہب کو امام ابو حنیفہ کے مذہب سے ہے۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ ان کا مذہب مذہب شافعی کے ساتھ ضم کر کے مدون نہیں کیا گیا جیسا کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے مذہب کے متعلق ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی تدوین امام ابو حنیفہ کے مذہب کی تدوین سے ہم رشتہ ہے۔ ہمارے خیال میں یہی وہ بات ہے جس کے باعث مذہب شافعی اور مذہب حنبلی دونوں کو ایک مذہب نہیں شمار کیا گیا، ورنہ ایک ایسے شخص کے لیے، جس نے ان دونوں مذاہب کی گہرائیوں میں اتر کر ان کو اپنی حقیقی شکل میں دیکھا ہو، انھیں ایک مذہب کی حیثیت سے مدون کر دینا چنداں دشوار نہیں۔

اب مذہب شافعی کو لو۔ (یہ مذہب اس حیثیت سے تمام مذاہب میں ممتاز ہے کہ) اوروں کی بہ نسبت اس میں مجتہد مطلق اور مجتہد فی المذہب زیادہ ہوئے ہیں۔ اسی طرح علمائے اصول و ارباب علم کلام اور مفسرین قرآن و شارحین حدیث کی کثرت میں بھی کوئی دوسرا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر اس لحاظ سے بھی وہ نمایاں خصوصیت کا مالک ہے کہ اس کی روایتیں اور سندیں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہیں، اس کے امام کے اقوال زیادہ صحت کے ساتھ منضبط ہیں، امام مذہب کے اقوال کو اصحاب وجوہ کے اقوال سے ممیز کر کے بیان کرنے اور (مذہب شافعی کے مختلف اقوال و آرا میں سے) ایک قول اور رائے کو دوسرے پر ترجیح دینے میں زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ — ان حقائق سے کوئی بھی ایسا شخص بے خبر نہیں، جس نے ان تمام مذاہب کا تحقیقی مطالعہ کیا ہو اور ان کے پیچھے اپنی عمر کا معتد بہ حصہ گزارا ہو۔

امام شافعی کے ابتدائی تلامذہ سب کے سب مجتہد مطلق (منتسب) تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا

نہ تھا جس نے امام مذکور کے تمام مجتہدات میں ان کی تقلید کی ہو۔ یہاں تک کہ ابن سُریج کا زمانہ آیا اور انھوں نے تقلید اور تخریج کے قواعد مرتب کیے۔ پھر ان کے شاگرد آئے اور وہ اسی راہ پر چلتے رہے جو ابن سریج تیار کر گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کو اُن مجددین میں شمار کیا جاتا ہے جن کے ہر صدی کے آغاز میں پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے۔

پھر اس شخص سے (جس نے تمام مذاہب کا مسلسل تحقیقی مطالعہ کیا ہو) یہ بات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ جن احادیث اور آثار پر مذہب شافعی کی بنیاد ہے، وہ باقاعدہ مدوّن ہیں، سارے اہل علم ان سے بخوبی واقف ہیں اور انھوں نے ان کی خدمتیں کی ہیں ـــــ یہ ایک ایسا خصوصی شرف ہے جو کسی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں ـــــ چنانچہ مذہب شافعی کی بنیادوں میں سے ایک کتاب مُوطا ہے، جو اگرچہ امام شافعی سے پہلے کی ہے مگر امام موصوف نے اپنے مذہب کے لیے اس کو (بنیادی) سنگ بنا قرار دیا۔ اسی طرح ان کے مذہب کی بنیادی یہ کتابیں ہیں: صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی۔ پھر مُسند شافعی، سنن نسائی، سنن دارقطنی، سنن بیہقی اور امام بغوی کی شرح السنۃ۔ ان میں سے (صحیح بخاری کے مولف) امام بخاری اگرچہ شافعیت کی طرف منسوب، اور اکثر فقہی مسائل میں امام شافعی کے ہم نوا ہیں مگر پھر بھی بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کے وہ اقوال و مسائل جن میں وہ تنہا ہیں (اور تمام شوافع کے خلاف رائے رکھتے ہیں) مذہب شافعی میں شمار نہیں ہوتے۔ اور امام ابوداؤد اور امام ترمذی مجتہد منتسب ہیں جن کا انتساب امام احمد و امام اسحاق کی طرف ہے۔ ابن ماجہ اور امام دارمی بھی، ہمارے خیال میں یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی رہے امام مسلم اور امام ابوالعباس اصم، جنھوں نے مسند شافعی اور کتاب "الاُمّ" کے جمع و ترتیب کی خدمت انجام دی ہے، نیز وہ حضرات، جن کا اوپر مسند شافعی کے ذکر کے بعد نام آیا ہے، تو یہ سب لوگ اپنا جداگانہ مسلک اور شافعیت سے آزاد راہ رکھنے والے ہیں، جن کے اپنے مستقل اصول، (جو مذہب) شافعی کے اصولوں سے کافی تفاوت رکھتے ہیں)

اگر ہماری اس تقریر کا ٹھیک ٹھیک مدعا تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا تو تم پر یہ حقیقت روشن ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اجتہاد مطلق کی سعادت سے بے بہرہ ہے وہ شخص جو مذہب شافعی کا دشمن ہو، اور حدیث کا علم انکاری ہے اس بدنصیب کی خیرسگالی سے جو شافعی اور اصحاب شافعی (کے فیض علمی) سے بے نیاز ہو۔

وَلٰكِنْ طُفَيْلِيَّهُمْ عَلٰى اَدَبٍ فَلَا اَرٰى شَافِعًا سِوَى الْاَدَبِ

ادب کے ساتھ ان کا دامن پکڑلو اب ہی اس مقصد میں تمہارا سفارشی ہوسکتا ہے۔

نوٹ:۔ یہی اس رسالہ یعنی "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کے آخری باب کا ترجمہ تھا جو رہ جاتا ہے لیکن چونکہ اس باب کا ترجمہ کسی قدر اختلاف بحث و اختلاف ترتیب کے ساتھ آج سے سات برس قبل ترجمان القرآن جلد ۱۲ عدد ۳، ۴، ۵، ۶ میں دیا جاچکا ہے، اس لیے اب یہاں اس کو دوبارہ دینا مناسب نہیں۔ اگر اس پورے مضمون کو یکجا کرکے رسالہ کی شکل میں شائع کرنے کی نوبت آئی تو اس وقت اس باب کو بھی شامل کردیا جائے گا۔

(مترجم)

حقیقت نماز

از

مولانا امین احسن اصلاحی

رسالہ "الاصلاح" سرائمیر اعظم گڑھ، میں مولانا نے "نماز" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں نماز کی اصل حقیقت بے نقاب کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ نماز ہی دین کا نقطۂ آغاز اور اس کی اصل روح ہے۔ یہ بصیرت افروز مقالہ مولانا کی نظر ثانی کے بعد اب کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی، دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

مقتضیاتِ ایمان

(۲)

ایمانیات خمسہ کی ضروری تشریح

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

۳- ایمان بالرسل قرآن عزیز نے ایمانیات خمسہ میں سے خاص اہمیت، زبردست خصوصیت اور پوری شدت کے ساتھ اللہ کے رسولوں پر — ایک رسول پر نہیں تمام رسولوں پر — ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ یہ چیز تمام امور متعلقہ کے لیے ایک ایسی کلّی حیثیت رکھنے والی حقیقت ہے کہ اس ایک ہی کے ہٹ جانے سے دوسری تمام حقیقتیں اپنی جگہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ اللہ پر، اس کی توحید پر، اس کی مالکیت و بادشاہی پر اور فرشتوں اور کتابوں پر اعتقاد، پھر دنیوی زندگی میں وہ رہنمائی جس پر خیر و صلاح کا، نیکی و تقویٰ کا، راست بازی و پرہیزگاری کا، امانت و دیانت کا، ہمدردی و حسن سلوک اور رواداری کا، اور انسانی زندگی کے تمام فرائض و واجبات، حقوق و آداب، ضوابط و قوانین، اور قواعد و آئین کا مدار ہے۔ پھر اخروی زندگی میں اعمال انسانی کی جزا و سزا، اور حساب و کتاب کا وہ عقیدہ جو اس پورے نظام کے استحکام کا ضامن ہے، غرض سب کچھ جو اسلام میں ہے "ایمان بالرسل" ہی پر موقوف و منحصر ہے۔ اگر یہی نہ ہو تو پھر سارا نظام فکر و عمل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم کسی قدر وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر قرآن کی آیات بینات، واضح ہدایات اور محکمات کی روشنی میں چند ضروری باتیں عرض کریں گے۔ پہلے رسالت و نبوت کی حقیقت بتائی جائے گی۔ پھر یہ کہ انسان عقل و خرد اور فہم و فراست رکھنے کے باوجود انبیائے کرام کی تعلیمات کا کیوں محتاج ہے اور انسانیت عامہ کی حیات طبعی اور حیات مابعد الطبیعی کی فلاح و کامیابی نبوت کی رہنمائی و

کارفرمائی کی کس لیے شدید حاجت مند ہے، اگرچہ اس کو اپنی اس ضرورت و احتیاج کا شعور نہ ہو۔

نبوت کیا ہے؟ یہ ایک منصب ہے ــــ ناگزیر و عظیم الشان منصب ــــ جس کے ذریعہ سے نوعِ انسانی پر وہ مابعد الطبیعی حقایق کھولے جاتے ہیں جن کا صحیح علم حاصل ہوئے بغیر انسان کا رویہ دنیا میں صحیح نہیں ہو سکتا، اور پھر اس رویے کی نظری و عملی توضیح کی جاتی ہے جو ان غیر محسوس حقیقتوں کی موجودگی میں انسان کو اختیار کرنا چاہیے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے، سمجھنے، بھلے برے میں تمیز کرنے، مفید و مضر کو الگ الگ چھانٹنے، اور صحیح و غلط کو جاننے پہچاننے کے لیے ظاہری و باطنی قوتیں دی ہیں، احساس و ادراک اور عقل و وجدان کی حیرت انگیز طاقتیں عطا فرمائی ہیں، اور ان سے کام لینے کی صلاحیتیں اور بے نظیر قابلیتیں اس کی فطرت میں ودیعت کر دی ہیں، پھر خارجی ماحول میں بے شمار اسباب و وسائل، آلات و اوزار، مفرد و مرکب اشیا، استعمال کرنے کے لیے مہیا فرما دی ہیں جن سے انسان اپنی ضرورتوں میں کام لیتا ہے، مگر ان میں سے کوئی چیز بھی یہ جاننے کے لیے کافی نہیں ہے کہ محسوسات کے پیچھے حقیقت نفس الامری کیا ہے اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کو دنیا میں کس مقصد کے لیے کس طریقے پر کام کرنا چاہیے۔ قیاسات اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں انسان اپنے لیے زندگی کا ایک نظریہ اور اس کے مطابق ایک طریقہ بنا لیتا ہے۔ جب تک یہ سب کچھ عقلی، فطری، طبعی اور تکوینی سنن الٰہیہ سے بہت زیادہ بعید اور متصادم نہیں ہوتا، بادی النظر میں کام اچھی طرح چلتا نظر آتا ہے، مگر جب ناواقفیت کی بنا پر زندگی کی گاڑی حقیقت سے بہت دور نکل جاتی ہے تو فسادِ عظیم نمودار ہونے لگتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ایک عام بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جس سے پوری انسانی آبادی شدت کے ساتھ متاثر ہو کر فلاکت و ہلاکت، تباہی و بربادی، خسران و خذلان میں ایسی مبتلا ہو جاتی ہے کہ خواص و عوام سب اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ یہ نتائج نہ صرف اس بات کا ثبوت دے دیتے ہیں کہ جو نظریۂ زندگی قیاسات اور تجربات و مشاہدات پر قائم کیا گیا تھا وہ غلط تھا، بلکہ انسانی تاریخ میں مسلسل ایسے ہی نتائج کا رونما ہوتے رہنا اس بات کا مستقل ثبوت ہے کہ نظریۂ زندگی قائم کرنے کے لیے سرے سے قیاسات، تجربات اور مشاہدات کوئی صحیح بنیاد ہی نہیں ہیں۔

پس جب تک خود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حقیقت کا علم دینے اور اس کے مطابق صحیح راستہ بتانے کے لیے انبیاء و رسل کو مقرر نہ کیا جائے، انسانی زندگی میں، امن، اطمینان، ہمواری، توازن اور عدل کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہی امن، اطمینان، ہمواری اور توازن و اعتدال وہ اہم ترین قدریں ہیں جو انسان کو زندگی میں مطلوب ہیں، لہٰذا جب ان قدروں تک عام انسان خود اپنی تلاش و سعی سے نہیں پہنچ سکتے تو لامحالہ ان کو اپنی حسی، عقلی، وجدانی قابلیتوں سے بالاتر قابلیت، اکتسابی فضیلتوں سے اعلیٰ فضیلت اور دماغی بلندیوں سے ارفع بلندی رکھنے والے رہنماؤں کی سخت ضرورت ہے جن کے پاس حقیقی علم، یقینی معرفت، کامل ایمان، اور بے آمیز فراست کا نور ہو، جو ضلالتوں میں بھٹکنے والی، خدا کی نعمتوں سے اپنی تباہی کا سامان کرنے والی، حیران و سرگشتہ، پریشان و درماندہ، مصیبتوں کی ماری ہوئی انسانیت کے سامنے ایک صحیح ترین نظام اور اس کے اجراء و نفاذ کا عملی پروگرام پیش کریں اور مرضیٔ الٰہی کے مطابق اس کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں برت کر بھی بتلا دیں۔ اسی مقصد اہم کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص برگزیدہ، نیک سیرت، نیک سرشت، پاک طینت، حکمت و دانائی کا پیکر، سراپا عصمت اور مجسم ہمت بندوں کو اپنا رسول بنا کر مبعوث فرمایا، اور ان کو القاء، الہام، اور وحی کے ذریعہ سے حق کا مکمل علم عطا فرمایا۔ یہ انبیاء وہم و گمان، شک و تذبذب، اور ظن و تخمین پر چلنے والی دنیا کے سامنے قطعی حجت، حتمی برہان اور اٹل استدلال کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ نہایت مضبوطی و پختگی سے انسانی اوہام، مزعومہ خیالات، فاسد قیاسات، نفسانی میلانات، اور ہر قسم کے غلط رجحانات کا قلع قمع کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سلیم الفطرت، صداقت پسند، عفت شعار، اور صاحب بصیرت انسانوں کو اپیل کرتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں صحیح استدلال، دلوں میں سچے جذبات، اور اعضاء و جوارح میں صحیح عملی حرکت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کو منظم کر کے دین حق کو قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اور جس دور میں بھی ان کی سعی بار آور ہوتی ہے انسانی زندگی میں امن، سکون، چین اور اطمینان حاصل ہونے لگتا ہے، اور خدا کی زمین فطرت کائنات سے ہم کنار ہو کر ایک بہارستان بن جاتی ہے۔

اگرچہ انسان کی اجتماعی زندگی میں قیادت وہ خاص خاص افراد بھی کر لیتے ہیں جن کو عام انسانوں کی بہ نسبت کسی قدر زیادہ غور و فکر، عقل و خرد اور سوجھ بوجھ کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی تجربہ کاری، ذہانت اور غیر معمولی علمیت سے فائدہ اٹھا کر انسانیت کی بنیادی اخلاقی قدروں کا کچھ حصہ کچھ حد تک اندازہ لگا لیتے ہیں اور پھر انہی کو حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کو خوش قسمتی سے ذرائع و وسائل بہم پہنچ جاتے ہیں تو وہ عام انسانوں پر اپنی دماغی و ذہنی برتری کا سکہ جما کر، اور کچھ اپنے اخلاق اور سیرت کی پختگی، ایثار، وقدوسیت اور نیک نفسی کا مظاہرہ کر کے دنیا پر چھا جاتے ہیں، لیکن جہاں کہیں الٰہی رہنمائی کے بغیر بعض انسانوں کو اس طرح کی اخلاقی و روحانی یا دنیوی ریاست قائم کرنے کا موقع ملا ہے اس کا انجام یہی ہوا ہے کہ لوگ آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور دوسرے بناوٹی خداؤں کو چھوڑ کر انھیں ارباب من دون اللہ بنا کر پوجنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو چالاکی، عیاری اور غیر معمولی ہشیاری کے سبب سے دلوں اور دماغوں پر اپنی سطوت و شوکت قائم کرتے ہیں اور بخت و اتفاق سے چلتے ہوئے خوش رنگ طریقوں کے بل پر کسی گرتی ہوئی قوم کے لیڈر بن جاتے ہیں۔ اپنی فلسفہ طرازی، فکری بلند پروازی، اور تقاضائے وقت کے مطابق پالیسی کی وجہ سے اپنی قوم پر چھا جاتے ہیں۔ ان کے گرد صرف وہ لوگ جمع ہوتے ہیں جو قومیت کے نشے میں سرشار اور تمام انسانیت کے عمومی مفاد کے بالمقابل محض اپنی ہی قوم و نسل کی برتری و فوائد پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ ایسے رہنماؤں کی قیادت میں یہ تو ممکن ہے کہ کوئی گرتی ہوئی قوم اٹھ جائے اور اس میں کچھ اخلاقی ذہنی و مادی رفعت بھی پیدا ہو جائے اور اس کی ایک طاقت ور ریاست بھی بن جائے۔ مگر اس کا آخری نتیجہ قوموں کی نزاع، بین الاقوامی ظلم، اور انسانیت کی مجموعی بدحالی کے سوا کچھ نہیں۔ ان دونوں قسموں کے روحانی اور مادی رہنماؤں کے پاس صحیح علم، اور قطعی ہدایت کی دولت گراں مایہ نہیں ہوتی جس سے وہ کوئی درست اور جامع نظام حیات پیش کر سکیں اور جو تمام ہی نوع انسان کے لیے عمومی فلاح و نجات کا ضامن و کفیل ہو سکے۔ اس لیے ان کے ظاہری طمطراق والے تمام کارنامے ایک دن الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں اور ان کی قیادت کا ضعف واضح ہو کر رہتا ہے۔

یہ ہے اصلی اور حقیقی فرق و امتیاز ان خود ساختہ رہنماؤں اور اللہ کے فرستادہ انبیاء کرامؑ کے درمیان۔

انبیاء کرام کی بعثت اور اسکی غرض و غایت

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی زمین پر اپنا خلیفہ اور رسول بنا کر بھیجا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو وحی الٰہی اور ہدایت ربانی کے تحت اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کا طریقہ اپنے علم و عمل دونوں سے بتا دیا جس پر نوع انسانی گامزن رہی اور ایک زمانۂ دراز تک اپنی فطری صلاحیتوں کو انہی الٰہی ہدایتوں اور احکام کے موافق استعمال کرتی رہی۔ پھر اس دور کے بعد نفس و شیطان کی شرارتوں سے بنی آدم کے درمیان تصادم اور کش مکش کی صورتیں پیدا ہونی شروع ہوئیں، انسانی برادری میں اختلافات رونما ہونے لگے اور تمام دنیا بگڑتے بگڑتے اس قدر بگڑ گئی کہ خیر و شر کی تمیز جاتی رہی، سعادت و شقاوت کا فرق مٹ گیا صحیح و غلط کے امتیازی حدود یک قلم رخصت ہو گئے اور تشتت و افتراق کی وہ المناک فضا پیدا ہو گئی جس کی اصلاح کے لیے سلسلۂ بعثت انبیاء کا آغاز ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

سارے انسان ایک ہی "امت" تھے (پھر ان کے آپس میں اختلافات پڑ گئے) تو اللہ نے نبیوں کو (صحیح رویۂ زندگی کی) خوش خبری دینے والے اور (اس راہ سے ہٹ جانے والوں کو) متنبہ کر دینے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری جو حق پر مشتمل تھی تاکہ وہ انسانوں کے درمیان ان تمام معاملات میں فیصلہ کر دے جن میں انھوں نے اختلاف کر لیا تھا۔ اور یہ اختلاف بھی انھوں نے آپس کی ضد کے مارے کیا تھا اس کے بعد کہ ان کے پاس حق آ چکا تھا اور واضح ہدایات دی جا چکی تھیں۔ پھر جو لوگ ان نبیوں پر ایمان لائے ان کو اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کی ہدایت فرما دی جس میں لوگوں نے اختلاف کر رکھا تھا، اللہ جس کو چاہتا ہے "صراط مستقیم پر" لگا دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں کو اسی لیے مبعوث

فرمایا ہے کہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے حضور میں اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر نہ کر سکیں کہ ہمارے پاس تو کوئی آپ کا فرستادہ حق کا پیام لے کر آیا ہی نہیں تھا اور نہ ہمیں آگاہ کیا گیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے، اسی لیے تو ہم ضلالت میں پڑے رہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (نساء)

ہم نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور آگاہ کرنے والے بنا کر اسی لیے تو بھیجا ہے کہ انسانوں کے پاس ان رسولوں کے بعد، اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہ جائے اور اللہ عزت والا، حکمت والا ہے۔

اس مضمون کی متعدد طریقوں سے متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تصریح فرمائی ہے۔ یہاں تمام آیتوں کو بالاستیعاب پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ایک اور آیت مبارکہ اس سلسلہ میں نہایت بصیرت افروز ہے۔ جس میں تمام انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اصلی ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے:۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (حدید)

ہم نے "بینات" کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب و میزان کو اتارا ہے تا کہ لوگ (اپنے نظام زندگی میں) عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں اور ہم نے لوہا پیدا کر دیا ہے جس میں سخت زور ہے اور انسانوں کے لیے بہت سی منفعتیں بھی ہیں۔

آیت کریمہ میں "حدید" کا لفظ جو استعمال کیا گیا ہے اور رسولوں کے متعلق یہ جو فرمایا گیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب اور میزان اس لیے دی گئی ہیں کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، ان دو حقیقتوں پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرات انبیائے کرام کی دنیا میں تشریف آوری کی غرض حقیقی کیا تھی۔ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانہ میں جہاں بھی جو نبی اور رسول مبعوث ہوا اس کی دعوت کا لب لباب اور خلاصہ یہ تھا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے اجتناب کرو۔

پس "ایمان بالرسل" کا مطلب یہ ہوا کہ دعوتِ اسلامی کے ان رہنماؤں کو مان لیا جائے جو ہر دور میں اللہ کی طرف سے انسانی دنیا کی قیادت و رہنمائی کرنے کے لیے مامور ہو کر آتے رہے ہیں۔ جب کبھی انسان اپنی غفلتوں اور خود فراموشیوں سے باز آ کر اللہ کی رضا اور خود اپنی فطرۃ سلیمہ کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرنا چاہے گا تو اس کے لیے ناگزیر ہوگا کہ ان ہی حضرات کی پیروی قبول کرے اور اقتدا کے لیے انہی کی ہدایات اور ان کے عملی نمونے تلاش کرے۔ پھر چونکہ تمام انبیا کرام کے بعد آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں، اور آپ پوری انسانیت کی طرف بھیجے گئے ہیں اس لیے اسلامی زندگی کے تمام پہلوؤں اور دعوتِ اسلامی کے تمام مراحل کے لیے صحیح لائحہ عمل وہیں سے مل سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص انبیاء و رسل کی شخصیتوں کو اور ان کے تاریخی کارناموں کو محض ایک تاریخی حقیقت کے اعتبار سے جانتا اور مانتا ہو تو یہ ہرگز اس کے مومن اور برسرِ ہدایت ہونے کے لیے کافی نہ ہوگا۔ راہ راست پر صرف وہ ہے جو انھیں خود اپنا رہنما تسلیم کرے، اعتقاد و عمل کے ہر گوشے میں ان کی پیروی قبول کرے، ان کی ہدایت کو بے خطا مانے، جو کچھ ان سے ثابت ہو اس کے آگے سر جھکا دینے میں چون و چرا نہ کرے، اور صرف "مذہب" ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ تہذیب و تمدن معاشرت و معیشت، سیاست و حضارت، قانون و عدالت، اور نظریات و افکار کے معاملات میں بھی ان کو سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرے، اور اس طرح اپنی پوری زندگی، اپنی پوری صلاحیتیں، انہی کی رہنمائی میں سپرد کر کے بے چون و چرا ان کی پیروی میں لگ جائے۔

اس طرح جب انسان انبیاء کی پیروی کرے گا تو لامحالہ اس کی زندگی کا مقصد وہی ہوگا جو انبیاء کی زندگی کا مقصد تھا، یعنی اقامت دین۔ اور اس کے لیے لازم ہوگا کہ اقامت دین کی اس جد و جہد میں ہر مرحلہ پر اپنے آپ کو انہی کی تعلیمات، افکار اور طریق کار کا پابند رکھے، اسی حکمت و دانائی اور تدریجی رفتار سے باطل کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اہلِ باطل سے انقطاع اور تصادم میں دعوت

ہجرت اور جہاد کے سارے قدم اسی طرح اٹھائے جس طرح ان بزرگوں نے اٹھائے ہیں۔ انبیاء کا حقیقی پیرو ان کے اخلاقی و روحانی کمالات اور ان کے معجزات و کرامات پر محض سر دھننے والا اور ان کے ذکر سے نری عقیدت کی پیاس بجھا لینے والا نہیں ہوگا بلکہ وہ اتباع حقیقی کے لیے ان کی سیرت کا مطالعہ کرے گا اور اپنی شخصی خواہشات، گروہی خیالات، قومی تعصبات، سب کو تج کر بالکلیہ ان کے طرز زندگی کے رنگ میں رنگتا چلا جائے گا۔ اگر "ایمان بالرسل" ایسا نہ ہو تو محض دل خوش کن عقیدتوں سے ان کے نام سن سن کر انگوٹھے چومنے سے اور درود و سلام کی کثرتوں سے کچھ نہیں ہوتا جب کہ انسان کی اپنی زندگی پر باطل محیط ہو اور وہ شیطانی ادیان سے انبیاء کے دین کی مغلوبی پر راضی و مطمئن ہو۔ نیز انبیاء کی پیروی کے ساتھ یہ طریقہ بھی سازگاری نہیں کر سکتا کہ زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے ایک حصہ میں کچھ "مذہبی" افکار و اعمال کی حد تک انبیاء کرام کی اتباع و پیروی کا نام لیا جاتا رہے اور دوسرے حصہ میں کچھ اختیاری طور پر اور کچھ اضطرار کے حیلوں اور بہانوں سے فقیہانہ نکتہ آفرینیوں کے ساتھ باطل اور اہل باطل کی پیروی، اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کر لی جائے۔ اسوۂ انبیاء پر چلنا اور ان کے طرز پر دنیا کو دعوت الی اللہ دینا تو غیر ممکن ہو لیکن ہر مادی تحریک اور ہر سعی جو عقل و تجربہ کی بنا پر قومی یا وطنی رنگ میں وقت و حالات کے تحت چل رہی ہو ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا کامیاب ہونا قرین قیاس سمجھا جائے۔

انبیاء و رسل پر ایمان لانے کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ ہمارا رویۂ زندگی مرضی الٰہی کے مطابق درست ہو جائے، اور اس مقصد کے حصول میں ہمارا قدم تیز ہو جائے جو وارث انبیاء ہونے کے اعتبار سے ہم پر بحیثیت "امۃ وسط" اور "امۃ مسلمہ" ہونے کے عائد ہوتا ہے، اور کوئی قانونی موشگافی یا منطقی باریک بینی ہمیں اس کام کا اقدام کرنے سے نہ روک سکے جو ایمان کے مقتضیات اور لوازم اور خصائص میں سے ہے۔

جن انبیاء کرام کے نام اور کام قرآن عزیز نے بتلائے ہیں ان پر اسی طرح ایمان لانا چاہیے جس طرح قرآن میں موجود ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، اتباع کے لیے ہونا چاہیے

پچھلے نبیوں کی تعلیمات اور سیرتیں جو کچھ اور جتنی کچھ قرآن نے محفوظ کر دی ہیں وہ تو محفوظ ہیں لیکن مفصل طور پر کسی کی تعلیم اور سیرت محفوظ نہیں رہی اس لیے زندگی کے جملہ معاملات میں اتباع کے لیے ان کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی اسی قوم کی ضروریات کے لیے روانہ کیا تھا اور اسی کے مطابق ہر رسول کی شریعت تھی۔ مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شریعت دی گئی وہ تمام دنیا کے انسانوں، ملکوں اور قوموں کے لیے ہے۔ انسانی فطرت اور عقلِ سلیم کے مطابق ہر ضرورت قیام قیامت تک کے لیے اس سے پوری ہو سکتی ہے۔ آپ کی نبوت آخری نبوت ہے اس لیے پوری انسانیت کے لیے یہ کافی بھی ہے اور رہنمائی کے لیے اس کا ہر خط و خال پوری حفاظت سے محفوظ بھی رکھا گیا ہے۔ اللہ کی آخری کتاب قرآن کا حال اگر یہ ہے کہ "فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ" تو آخری رسول کا حال یہ ہے کہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ (باقی)

فہرستِ مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

تفہیمات	ہے	تنقیحات	عاِر	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۴ر		
خطبات (قسم دوم)	۱۲ر	ہیگل، مارکس اور نظام اسلام	عاِر	معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ر		
دینیات (قسم اول) مجلد	عاِر	اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	عہ	تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۶ر		
″ (″ دوم)	عہ	اسلام کیا ہے؟ (انگریزی)	ہیہ	علماء اور اسلام	۱۲ر		
روداد جماعت اسلامی (حصہ اول)	۱۰ر	دینِ حق	۴ر	اسلام اور جاہلیت	۶ر	اسلامی نظام	عہ
″ ″ (″ دوم)	۹ر	نشانِ راہ	ہر	اخلاقی نقطۂ نظر	۴ر	اسلام کا سیاسی نظریہ }	۸ر
″ ″ (″ سوم)	عہ	سلامتی کا راستہ	۴ر	جہاد فی سبیل اللہ	۶ر	اور فلاح عالم	
مسئلہ قومیت	ہیہ	نیا نظام تعلیم	۳ر	اسلام کا نظریۂ سیاسی	۴ر	اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں	۸ر

رسائل و مسائل

خلافت کے لیے قریشیت کی شرط

سوال: اسلام تمام دنیا کو پیغام دیتا ہے کہ سب انسان بحیثیت انسان ہونے کے برابر ہیں، گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اسلام کے حرم میں داخل ہوتے ہی سب اونچ نیچ برابر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی فرق رہتا ہے تو وہ بس اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کے اصول پر رہتا ہے۔ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کا مفہوم یہ یا اس کے قریب ہے کہ خلافت قریش میں رہنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے تو پھر ہٹلر ہی نے کیا برا کیا اگر اپنی قوم کو تمام دنیا کی قوموں پر فائق اور سرداری کا حق دار ٹھیرایا؟ اور پھر اگر ایک قریشی کے لیے یہ حق ہے کہ قریش کو نہ صرف عجم پر بلکہ خود اہل عرب پر بھی فوقیت دے تو آخر مغربی اقوام ہی دوسری قوموں کو کم تر ٹھیرانے میں کیوں حق بجانب نہیں؟ اسلام کی اس دعوت کو حدیث کی اس روایت کے ساتھ کیونکر منطبق کیا جا سکتا ہے؟

جواب: بسا اوقات آدمی ایک خاص، حدں میں خاص موقع و محل پر ایک بات کہتا ہے جو اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتی ہے، لیکن جب وہی بات اپنے محل سے الگ کر کے نقل کی جاتی ہے تو اس کی شکل کچھ اور ہی بن جاتی ہے اور اس سے ایسے معنی نکل آتے ہیں جو خود قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ اُس معنی کی احادیث کے ساتھ بھی پیش آیا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ اسی غلط فہمی میں پڑ کر فقہائے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے خلافت کے لیے منجملہ اور شرائط کے قریشیت کو بھی ایک قانونی شرط قرار دے لیا۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا کچھ اور تھا۔

اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم ایک طرف اسلام کے اصولوں کی دعوت و تبلیغ بالکل بے لاگ طریقہ سے فرماتے تھے تو دوسری طرف ایک بالغ النظر مدبر کی حیثیت سے وقت اور سوسائٹی اور ماحول کے واقعی حالات پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور ایسی تدابیر عمل میں لانے سے پرہیز فرماتے تھے جو چاہے اصولاً اپنی جگہ صحیح ہوں مگر واقعی حالات کا لحاظ کیے بغیر ان کو عملی جامہ پہنا دینے سے عظیم تر فتنہ رونما ہونے کا اندیشہ ہو۔ آپ نے اُس وقت کے عرب کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھا تھا، اور بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ قریش کا قبیلہ اپنے مردان کار کی قابلیت اور اپنے اُن اثرات کی بنا پر جو اسے صدیوں سے ملک میں حاصل تھے، اتنا طاقت ور قبیلہ ہے کہ اگر اس کی موجودگی میں آپ کے بعد کسی غیر قریشی کو امیر بنا دیا گیا تو وہ کامیاب نہ ہوسکے گا۔ اسلام کی جمہوری روح آپ نے لوگوں میں پھونک دی تھی اس کی بنا پر عین ممکن تھا کہ مسلمان اس روح کا مظاہرہ کرنے کے لیے آپ کے بعد کسی آزاد کردہ غلام کو خلیفہ بنا لیتے، یا کسی بے اثر قبیلہ کے شیخ کو منتخب کر لیتے۔ لیکن اس وقت ملک کا اجتماعی نظام عملاً جس طرح کا تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہایت غلط تدبیر ہوتی۔ اسی وجہ سے آپ نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ آپ کا جانشین کوئی قریشی ہونا چاہیے۔

حضورؐ کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے۔ قریش کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے دور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے اور معلوم ہے کہ ان چاروں کی ٹکر کا کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔ پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اموی سلطنت قائم کی، اسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا، اسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کر دی، اور اسی نے مصر میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کی۔ ایسی زبردست قابلیتوں اور اثرات کے مالک قبیلہ کی موجودگی میں اگر عملی سیاست کو نظر انداز کر کے محض نظری سیاست کا مظاہرہ کیا جاتا تو نتیجہ خلافت کی ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ قانونی حیثیت سے نہ تھا کہ از روئے شرع خلیفہ کو قریشی ہونا چاہیے اور غیر قریشی کو خلافت کا حق ہی نہیں ہے، بلکہ وہ عملی سیاست کے لحاظ سے ایک ہدایت تھی۔ اور

ساتھ ہی آپ نے یہ پیشنگوئی بھی کر دی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور فی الجملہ دین کی علمبرداری کرتے رہیں گے اور ان میں وہ آدمی بھی مردان کار پائے جائیں گے ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں، احادیث کے تتبع سے اس کی پوری وضاحت ہو سکتی ہے۔

مسند احمد میں عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا قریش قادۃ الناس، "قریش اہل عرب کے لیڈر ہیں"۔ بیہقی میں حضرت علی کی روایت اس معنی پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں حضور صلعم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ کان ھذا الامر فی حمیر فنزعہ اللہ منھم وجعلہ فی قریش "پہلے عرب کی سرداری حمیر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ نے ان سے چھین کر قریش کو دے دی"۔ دوسری روایات میں اس مضمون کی اور زیادہ تشریح ملتی ہے۔ مثلاً الناس تبع لقریش فی الخیر والشر، "بھلائی ہو یا برائی، دونوں راستوں میں اہل عرب قریش ہی کے پیچھے چلتے ہیں"۔ یا الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم، "اچھے لوگ قریش کے اچھوں کی اور بدکار لوگ قریش کے بدکاروں کی پیروی کرتے ہیں"۔ الناس تبع لقریش فی ھذا الشان، مسلمھم لمسلمھم وکافرھم لکافرھم "اہل عرب سرداری قریش ہی کی مانتے ہیں، مسلمان قریش کے مسلمانوں کی پیروی کرتے ہیں اور کافر قریش کے کافروں کی"۔ اسی مضمون کو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنی سقیفہ بنی ساعدہ والی تقریر میں بیان فرمایا تھا کہ فاما العرب فلن تعرف ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش، "اہل عرب تو قبیلہ قریش کے سوا کسی اور کی سرداری سے آشنا ہی نہیں ہیں"۔ یہ سب کچھ بیان واقعہ ہے۔ جو کچھ اُس وقت عرب کے واقعی حالات تھے اور صدیوں کی تاریخ نے جو حقیقی صورت حال پیدا کر دی تھی، وہی ان روایات میں بیان کر دی گئی ہے۔ ان میں کہیں بھی کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ قریش سردار ہوں۔ بلکہ اس واقعہ کو بطور ایک واقعہ کے بیان کیا گیا ہے کہ قریش ملک کے سردار ہیں۔ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے بہت پہلے وجود میں آچکا تھا، ساری قوم کے نفسیات پر یہی لوگ چھائے ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو میں

یہ آگے تھے اور قوم ان کے پیچھے چلتی تھی۔ پھر جب کہ کفر کی طرح اسلام میں بھی یہی پیش پیش رہے اور انہی کے اثر سے اہل عرب نے اس دین کو قبول کیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی اس واقعی اور تاریخی سرداری کے خلاف جنگ کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش میں خواہ مخواہ قوت ضائع کی جاتی۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو ہدایت فرمائی کہ اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے زمانۂ اسلام میں بھی قریش کو سرداری کے مرتبہ پر قائم رہنے دو۔ قدموا قریشا ولا تقدموھا "قریش کو آگے رکھو، ان کے مقابلہ میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔"

پھر آپ نے متعدد مواقع پر اس بات کی بھی صراحت فرما دی کہ قریش اس مرتبہ پر اس وقت تک سرفراز رہیں گے جب تک ان میں سرداری کی صلاحیت رہے گی اور جب تک وہ اس دین کو قائم رکھیں گے

ان ھذا الامر فی قریش لا یعادیھم	یہ سرداری قریش میں باقی رہے گی اور جو ان کا مقابلہ کرے گا
احد الا کبہ اللہ علی وجھہ ما اقاموا الدین	اللہ اس کو منہ کے بل گرا دیگا جب تک وہ اس دین کو قائم کرتے
الائمۃ من قریش ما اذا حکموا	سردار قریش ہی میں سے ہوتے رہیں گے جب تک وہ اپنے حکم میں
فعدلوا و وعدوا فوفوا واسترحموا	انصاف اور اپنے وعدوں کو وفا اور خلق اللہ پر رحم کرتے رہیں گے۔
لا یزال ھذا الامر فی قریش ما بقی	یہ سرداری قریش میں رہے گی جب تک ان میں
منھم اثنان	دو مرد ان کا بھی باقی رہیں گے۔

ان ارشادات میں صریح طور پر یہ بات متضمن ہے کہ جب قریش اپنی اس اہلیت کو کھو دیں گے تو سرداری ان سے نکل جائے گی اور غیر قریشی بلکہ غیر اہل عرب تک سردار و پیشوا بن جائیں گے۔ اگر اسلامی شریعت میں از روئے ضابطہ خلافت صرف قریش ہی کا حق ہوتی اور غیر قریشی کو کسی صورت میں یہ حق پہنچتا ہی نہیں تو یہ بات آخر کیسے کہی جا سکتی تھی۔

حضرت علی کی امیدواری خلافت؟

سوال: جماعت اسلامی کے ارکان بالعموم موجودہ زمانہ کے جمہوری طریقوں پر جو تنقیدیں کرتے

ہیں ان میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ جو شخص خود کسی منصب یا عہدے کا امیدوار ہو یا اس کا دعویدار بنے، اسلام کی رو سے وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے منتخب کیا جائے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی جو خلافت کے امیدوار یا دعویدار رہے تھے اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

جواب: حضرت علی کی امیدواری و دعویداری کا قصہ دراصل ایک بڑے قصے کا جزو ہے جس کی بنا بعض مخصوص روایات پر قائم ہے۔ اس جزو کو کل سے الگ کر کے تنہا اسی پر بحث کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر آپ اس جزو کو مانتے ہیں تو اس پورے قصے کو ماننا پڑے گا جس کا جزو یہ ہے اور پھر اس پر بحث کرنی ہوگی۔

اس قصے کی روایات بہت مشہور ہیں۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد کے واقعات کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اور ابن قتیبہ اپنی الامامۃ والسیاسۃ میں جو نقشہ کھینچا ہے، اور ایسے ہی دوسرے لوگ جو روایات اس سلسلے میں بیان کرتے ہیں، وہ سب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اگر آپ اس تاریخ کو باور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمد رسول اللہ ﷺ مبلغ قرآن، داعی اسلام، مزکی نفوس کی شخصیت پر اور ان کی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر خط تنسیخ کھینچ دینا پڑے گا اور تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ و ہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی، اس کی بنیاد میں جس جماعت نے بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کر کے اسلام کا جھنڈا دنیا میں بلند کیا تھا، اس کے اخلاق، اس کے خیالات، اس کے مقاصد، اس کے ارادے، اس کی خواہشات، اور اس کے طور طریق عام دنیا پرستوں سے ذرہ برابر بھی مختلف نہ تھے۔

اس تاریخ میں ہمارے سامنے کچھ اس طرح کا نقشہ آتا ہے کہ ایک حوصلہ مند شخص نے کئی سال کی جانفشانی سے لڑ بھڑ کر ایک ملک فتح کیا تھا اور اپنے زور بازو سے ایک سلطنت قائم کرلی تھی۔ پھر قضائے الٰہی سے اس نے وفات پائی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے رفیقوں اور ساتھیوں نے جو سب اسی کے بنائے ہوئے آدمی تھے، اور جن پر وہ تمام عمر اعتماد کرتا رہا، یکایک آنکھیں پھیر لیں۔

ابھی اس کے ٹھکروائے اس کی تجہیز و تکفین ہی میں مشغول تھے کہ اس کے ساتھیوں کو یہ فکر پڑ گئی کہ کسی طرح تختِ شاہی پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ وہ جمع ہوئے اور پہلے آپس میں جھگڑا کرتے رہے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ لقمۂ تر میرے منہ میں آئے۔ آخر بڑی ردّ و کد کے بعد انھوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ کارروائی جب مکمل ہو گئی تو بانیٔ سلطنت کے خاندان والوں کو اس کی خبر پہنچی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مرحوم کا بیٹا تو کوئی تھا نہیں۔ ایک داماد تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میرے ہوتے اور کون وارثِ تاج و تخت ہو سکتا ہے۔ بیٹی بھی پیچ و تاب کھانے لگی کہ جو سلطنت ان کے باپ نے برسوں کی جانفشانی سے قائم کی تھی اس پر دوسروں کو قبضہ کر لینے کا کیا حق ہے۔ پہلے تو خاندان والے آپس میں سر جوڑ کر مشورے کرتے رہے۔ پھر انھوں نے مرحوم بادشاہ کے پرانے پرانے ساتھیوں کو اس کے احسانات یاد دلا دلا کر اپیل کرنے شروع کیے اور پبلک میں اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ مرحوم کا داماد اس کی بیٹی کو وزرائے سلطنت کے محلوں میں لیے لیے پھرتا رہا اور ایک ایک با اثر قبیلے میں اسے لے گیا تاکہ شاید اسی کی فریاد سے لوگوں کے دل پگھل جائیں۔ مرحوم بادشاہ کی قبر کو بھی خطاب کر کر کے دہائیاں دیں کہ شاید یہی اپیل کارگر ہو جائے۔ مگر کسی نے سن کر نہ دی۔ آخر بیچارہ تھک ہار کر بیٹھ رہا، اور جب مرحوم کی بیٹی بھی، جو اس کے دعوے کی اصل بنیاد تھی، دنیا سے رخصت ہو گئی، تو اس غریب نے جا کر بادل ناخواستہ غاصبِ تخت کی اطاعت قبول کر لی، مگر دل میں وہ برابر پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقتاً فوقتاً اپنے اس پیچ و تاب کا اظہار بھی کسی نہ کسی طرح کرتا رہا۔

کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیتؓ اور ان کے اصحابؓ کبار کی؟ کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بانیانِ سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبرِ خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم و صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوئے تھے؟ آخر اس نقشے کو کیا مناسبت ہے قرآن اور اس کی پاکیزہ ترین تعلیمات سے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی ان بلند ترین اخلاقی ہدایات سے جو ذخیرۂ حدیث میں بھری پڑی ہیں؟ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ان سوانح حیات سے جن میں (اس ایک قصے کے سوا) دنیا طلبی کا کوئی

شائبہ تک نظر نہیں آتا؟ ابوبکرؓ و عمرؓ کی ان زندگیوں سے جن کا کوئی رنگ بھی دنیا کے بھوکے لوگوں کے رنگ ڈھنگ سے نہیں ملتا؟ اور صحابہ کرام کی ان سیرتوں سے جن کے مجموعے میں اس واقعہ کے کھینچے ہوئے نقشے کو رکھ کر دیکھا جائے تو کسی طرف سے بھی اس کا جوڑ ان کے ساتھ بیٹھتا نظر نہیں آتا؟ پھر اگر اس گروہ کی تاریخ کا پورا مستند ذخیرہ ہمارے سامنے اس کے اخلاق، اس کی سیرت، اس کی ذہنیت اور اس کے نفسیات کا کچھ اور نقشہ پیش کرتا ہے اور صرف ایک مجموعۂ روایات اس کے بالکل برعکس ایک اور ہی نقشہ پیش کر رہا ہے تو آخر عقل کیا کہتی ہے؟ کیا یہ کہ سمندر میں اتفاقاً آگ لگ گئی تھی؟ یا یہ کہ سمندر میں پانی تھا ہی نہیں، آگ ہی آگ تھی؟ یا یہ کہ آگ لگنے کا قصہ جھوٹا ہے، جب تمام شہادتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ سمندر تھا تو وہاں پانی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا؟ تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں۔ مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ معاذ اللہ رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں، اصل میں تو ایک شخص نے ان چالوں سے دنیا کو پھانسا تھا تاکہ اپنی ایک سلطنت بنائے اور اس قسم کے دنیا طلب مکاروں کے گرد جیسے لوگ جمع ہوا کرتے ہیں ویسے ہی لوگ اس کے گرد بھی جمع ہو گئے تھے اور تقدس کے اس ظاہری پردے میں دراصل وہ جن مقاصد کے لیے کام کر رہا تھا ان کا راز آخر کار اس کے اپنے گھر والوں نے فاش کر کے رکھ دیا۔

اس کے مقابلہ میں تاریخ کچھ اور روایات بھی پیش کرتی ہے۔ ذرا ان کو بھی دیکھ لیجیے۔ علامہ ابوجعفر ابن جریر طبری پوری سند کے ساتھ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات پوچھے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بیان کیا:

ان علی ابن ابی طالب کان فی	علی ابن طالب اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص نے
بیتہ اذ جاءہ من انبأہ ان ابابکر قد	ان کو جا کر خبر دی کہ ابوبکر بیعت لینے کے لیے بیٹھے ہیں۔
جلس للبیعة. فخرج فی قمیص لہ ما علیہ	یہ سن کر وہ چادر اور ازار کے بغیر نرے قمیص ہی میں نکل

ازار، لا رداء، عجلا کراھیۃ ان یبطئ عنھا حتی بایعہ، ثم جلس الیہ و بعث الی ثوبہ، فاتاہ فجللہ و لزم مجلسہ

کھڑے ہوئے۔ اتنی دیر کرنی بھی انھوں نے پسند نہ کی کہ کپڑے پہن لیں۔ پہلے جاکر بیعت کی، پھر گھر سے کپڑے منگائے اور پہن کر مجلس میں بیٹھے۔

بیہقی کی روایت اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ وہ ابو سعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ:

فصعد ابوبکر المنبر فنظر فی وجوہ القوم فلم یر الزبیر قال فدعا بالزبیر فجاء، فقال قلت ابن عمۃ رسول اللہ و حواریہ، اردت ان تشق عصا المسلمین؟ فقال لا تثریب یا خلیفۃ رسول اللہ، فقام فبایعہ. ثم نظر فی وجوہ القوم فلم یر علیا فدعا بعلی بن ابی طالب، فجاء، فقال قلت ابن عم رسول اللہ وختنہ علی ابنتہ، اردت ان تشق عصا المسلمین؟ قال لا تثریب یا خلیفۃ رسول اللہ فبایعہ۔

پھر ابوبکر منبر پر چڑھے اور حاضرین مجلس پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ زبیر موجود نہیں ہیں۔ ان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا جب وہ آئے تو فرمایا، میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ کے پھوپھی زاد بھائی اور حضور کے حواری کہاں ہیں۔ کیا تم مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا اے جانشین رسول معاف فرمایئے۔ پھر اٹھے اور بیعت کی۔ پھر ابوبکر نے مجمع پر دوبارہ نظر ڈالی اور دیکھا کہ علی نہیں ہیں۔ انھیں بلانے کے لیے بھی آدمی بھیجا۔ جب وہ آ گئے تو فرمایا، میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ کے چچازاد بھائی اور داماد کہاں رہ گئے، کیا تم مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انھوں نے بھی فرمایا کہ اے جانشین رسول! معاف فرمایئے۔ پھر بیعت کی۔

ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تھوڑا سا اختلاف نظر آتا ہے وہ محض تفصیل کا فرق ہے، ورنہ دراصل دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ پھر اس کی مزید تائید حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اس روایت سے ہوتی ہے جو موسیٰ بن عقبہ نے عمدہ سند کے ساتھ اپنے مغازی میں نقل کی ہے:-

ثم خطب ابوبکر واعتذر الی الناس وقال ما کنت حریصا علی الامارۃ یوما ولا لیلۃ ولا سألتھا فی سر ولا علانیۃ

پھر ابوبکر نے (بیعت کے بعد) خطبہ دیا اور اپنی معذرت پیش کرتے ہوئے فرمایا "میرے دل میں ایک دن یا ایک رات کے لیے بھی امارت کی ہوس نہ تھی، اور نہ میں کبھی خفیہ یا علانیہ

فقبل المهاجرون مقالته وقال علي والزبير ما غضبنا الا لانا اخرنا عن المشورة وانا نرى ابابكر احق الناس بها. انه لصاحب الغار وانا لنعرف شرفه وخيره ولقد امره رسول اللّٰہ ان يصلي بالناس وهو حي

اس کی خواہش کی" سب مہاجرین نے حضرت ابوبکر کی اس تقریر کو خاموشی سے سنا۔ البتہ علی اور زبیر نے اتنا کہا کہ ہم کو شکایت صرف اس بات کی ہے کہ ہمیں مشورے میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ ہم بھی ابوبکر کو سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں، وہ رسول اللہ کے رفیق غار ہیں۔ ان کے شرف اور ان کی تجربہ کاری کا ہمیں اعتراف ہے اور رسول اللہ نے اپنی زندگی میں انہی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کیا تھا۔

پھر علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں اپنی یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہؓ کے پاسِ خاطر سے چھ مہینے تک خانہ نشین رہے، کیونکہ وہ تقسیم میراث کے معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہو گئی تھیں، اور حضرت علی نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو داغ ان کے دل کو لگا ہے اس پر کسی ادنیٰ وجہ ملال کا بھی اضافہ ہو۔ بعد میں جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علی نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت ابوبکر سے بیعت کی تجدید کی اور معاملات میں حصہ لینا شروع کیا۔[ل]

ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرے میں نہیں الجھنا چاہتے۔ ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کر دی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کونسی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت، و اصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل ریجھتا ہو تو ریجھے، مگر اس کے ساتھ ایک امیدواری و دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی اس دوسری تصویر کو قبول کرے تو اس میں سرے سے اس واقعہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ حضرت علی منصب خلافت کے امیدوار یا دعویدار تھے۔

ل؎ ایک اور روایت محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "الصدیق" میں نقل کی ہے جس کی تحقیق کا مجھے موقع نہیں ملا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر کی بیعت ہو گئی تو جناب ابوسفیان نے حضرت علی کو دعویداری خلافت کے لیے اکسانے کی کوشش کی تھی۔ مگر حضرت علی نے ان کو جواب دیا کہ تمہاری عمر کا ایک بڑا حصہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں گذر چکا ہے، اب اپنے سابق نامۂ اعمال میں کچھ اور اضافہ نہ کرو تو بہتر ہے۔ میرے نزدیک ابوبکر اس منصب کے اہل ہیں جو انہیں دیا گیا ہے۔

اسلام بلاجماعت

سوال: جو شخص آپ کی جماعت کے اصولوں کے مطابق حتی المقدور صحیح اسلامی زندگی بسر کر رہا ہو، وہ اگر بعض اسباب کے تحت باقاعدہ جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس کے متعلق میرا وہی خیال ہے جو احادیث سے ثابت ہے، یعنی صحیح اسلامی زندگی بغیر جماعت کے نہیں ہوتی۔ صحیح اسلامی زندگی کے لیے سب سے مقدم چیز اسلام کے نصب العین سے وابستگی ہے۔ اس وابستگی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس نصب العین کے لیے جدوجہد کرے۔ اور یہ جدوجہد اجتماعی طاقت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جماعت کے بغیر کسی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی سمجھنا بالکل غلط ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص ہماری اس جماعت میں شامل نہ ہو اور کسی دوسری جماعت سے اس کا تعلق ہو جس کا نصب العین اور نظام جماعت اور طریق جدوجہد اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ اس صورت میں ہمیں اس کو برسر ہدایت ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ سرے سے اس کی کوئی جماعت ہی نہ ہو اور وہ محض انفرادی طور پر ان طریقوں کی پابندی کرتا رہے جو شخصی کردار کے لیے شریعت میں بتائے گئے ہیں، ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے، اور ہم اس کو کم از کم نیم جاہلیت کی زندگی سمجھتے ہیں۔ اسلامیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنے گرد و پیش ایسی کوئی جماعت نظر آتی ہو جو اسلام کے اجتماعی مقصد "اقامت دین" کے لیے اسلامی طریق پر سعی کرنے والی ہو، تو اسے سچے دل سے ایسی ایک جماعت کے وجود میں لانے کی سعی کرنی چاہیے اور اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جب ایسی جماعت پائی جائے تو اپنی انانیت چھوڑ کر صحیح جماعتی ذہنیت کے ساتھ اس میں شامل ہو جائے۔

علم ظاہر اور علم باطن

سوال: اسلاف کی کتب پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "علم باطنی" ایک ایسا علم ہے جو قرآن

وحدیث اور فقہ وغیرہ علوم سے جدا محض سخت ریاضات و مجاہدات سے حاصل ہو سکتا ہے، چنانچہ امت مسلمہ میں بکثرت انسان ایسے ہوئے ہیں جن کی زندگیوں میں یہ ترتیب ملتی ہے کہ پہلے انھوں نے کتاب وسنت اور فقہ وکلام وغیرہ علوم کی تحصیل کی اور ان کو "علم ظاہری" کا خطاب دیا۔ اس کے بعد "علوم باطنی" کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے لیے سخت سے سخت ریاضتیں کیں تب کہیں جا کر انھیں "روحانی علوم" حاصل ہوئے، اور ان کو انھوں نے ہمیشہ علوم ظاہری پر ترجیح دی۔ براہ کرم کچھ اس پر روشنی ڈالیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے علم باطنی کی کیا تعریف ہے؟ اس کی حقیقت کیا تھی اور اس میں کتنی رنگ آمیزیاں ہوئیں؟ کیا یہ علم ریاضات ومجاہدات کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتا؟ اور یہ کہ کیا علوم ظاہری کی تحصیل کے بغیر بھی یہ علم حاصل ہو سکتا ہے؟

جواب: آپ کا سوال بہت تفصیل طلب ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر میں بارہا اپنے مضامین میں روشنی ڈال چکا ہوں، اگرچہ براہ راست اس خاص موضوع پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ ظاہر سے مراد اگر احکام ہوں اور "باطن" سے مراد حکمت دین ہو، نیز ظاہر سے مراد اگر احکام شرعی کی تعمیل ہو اور باطن سے مراد اُس اعتقادی و اخلاقی روح کا سمجھنا اور اپنے نفس اور سیرت و کردار میں اُسے جاری و ساری کرنا ہو جو احکام شرعی کی تعمیل میں درحقیقت مطلوب ہے، تو ظاہر و باطن کی یہ تفریق صحیح ہے۔ لیکن اس تفریق کے لحاظ سے باطن کا منبع بھی وہی ہے جو ظاہر کا منبع ہے یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔ اور اس باطن کے لیے تلاوت قرآن، مطالعہ سیرت پاک، اور صوم وصلوٰۃ اور دوسرے احکام شریعت کی پابندی کے سوا کسی اور مجاہدہ وریاضت کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر باطن سے مراد وہ فلسفے ہیں جو تصوف کے نام سے مسلمانوں میں رائج ہوئے تو ان کا منبع قرآن وسنت نہیں ہیں، بلکہ افلاطون اور فلاطینوس اور ویدانت وغیرہ کی تعلیمات ہیں۔ اور جو مشقیں اور ریاضتیں اس غرض سے کی جاتی ہیں کہ ان فلسفوں کے مطابق حقیقت کا مشاہدہ حاصل ہو، نیز خوارق اور کشف اور عجائب کے صدور کی قوت حاصل ہو، ان کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے چاہے ان اعمال کی بعض شکلیں اسلامی عبادات کی شکلوں سے ملتی جلتی ہوں، اور اس فن کی

بعض اصطلاحات اسلامی لغت سے مستعار لے لی گئی ہوں۔

امانت، قرض، صلۂ رحمی

سوال: (۱) امانت رکھنے اور رکھوانے والے کو کیا کیا اصول ملحوظ رکھنے چاہئیں؟

(۲) قرض حسنہ دینے اور لینے میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے؟

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم کیا ہے اور شریعت میں اس کی اہمیت کس حد تک ہے؟

جواب: (۱) امانت اصل میں دو آدمیوں کے درمیان باہمی اعتماد کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھتا ہے وہ گویا اس پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ پوری ایمانداری کے ساتھ اس کی امانت کی حفاظت کرے گا۔ اور جو شخص اس امانت کو اپنی حفاظت میں لینا قبول کرتا ہے وہ بھی امانت رکھنے والے پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ ایک جائز قسم کی امانت اس کے پاس رکھ رہا ہے، کوئی چوری کا مال یا خلاف قانون چیز نہیں رکھ رہا ہے، نہ اس امانت کے ذریعہ سے کسی قسم کا دھوکا یا فریب کرکے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پس دونوں پر اس کے سوا کسی اور چیز کی پابندی لازم نہیں ہے کہ وہ اس اعتماد کا پورا پورا حق ادا کریں۔

(۲) قرض دینے اور لینے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ حتی الامکان فریقین کے درمیان شرائط قرض صاف صاف طے ہوں، مدت کا تعین ہو جائے، تحریر اور شہادت ہو۔ جو شخص قرض دے وہ اس قرض کے بدلے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے، اور مقروض کو احسان رکھ کر اذیت پہنچانے کی بھی کوشش نہ کرے۔ نیز اگر مدت گزر جائے اور فی الواقع مقروض شخص قرضہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کو جہاں تک ممکن ہو مہلت دے اور اپنے قرض کی وصولی میں زیادہ سختی نہ کرے۔ دوسری طرف قرض لینے والے کے لیے یہ لازم ہے کہ جس وقت وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو اسی وقت اس کو ادا کر دے اور جان بوجھ کر ادائے قرض میں تساہل یا ٹال مٹول نہ کرے۔

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم رشتہ داری کے تعلق کی بنا پر ہمدردی، معاونت، حسن سلوک، خیر خواہی اور جائز حدود تک حمایت کرنا ہے۔ اس کی کوئی حد نہ مقرر ہے، نہ کی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ عام معروفات

میں سے ہے جنھیں لوگ خود ہی جانتے ہیں۔ اور صلۂ رحمی میں کوتاہی کرنا یا قطع رحمی کرنا ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن کی سخت مذمت قرآن و حدیث میں آئی ہے۔

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

سوال: ہماری بستی میں ایک صاحب ہیں جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی کے پابند ہیں، گناہ کبیرہ سے پرہیز کرنے والے ہیں، مگر ان کا کچھ عجیب حال ہے۔ مثلاً وہ والدین کی خدمت تو سر انجام دیتے ہیں اور ان کے کام میں بھی مدد کرتے ہیں، مگر ان کی املاک سے کچھ نہیں لیتے، حتیٰ کہ ان کا کھانا تک نہیں کھاتے، محض اس بنا پر کہ ان کے والد کاروبار کے فروغ کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے تمام عزیز و رشتہ دار جن کی کمائیوں میں انھیں حرام آمدنی کے شامل ہونے کا شبہہ ہوتا ہے، ان کے ہاں بھی کھانے پینے سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ رشوت خوروں، سرکاری ملازموں، سودی لین دین کرنے والوں اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں بددیانتی کرنے والوں سے بھی ان کا یہی معاملہ ہے۔ حد یہ کہ ایک امامِ مسجد ہیں جن کو ناجائز کمائی کرنے والے بعض اصحاب وظیفہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ان کے ہاں بھی کھانے یا چائے وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ اگر کبھی سفر میں مجبوراً کسی ایسے شخص کے ہاں کھانا کھا لینے کی نوبت آ جائے تو یہ کھانے کی قیمت کا اندازہ کر کے اس سے زیادہ قیمت کا کوئی ہدیہ وہاں روانہ کر دیں گے۔ اور اگر کسی ناجائز کمائی کرنے والے کے ہاں مجبوراً کچھ کھا پی لیں گے تو وہ اس کا معاوضہ خیراتی فنڈ میں جمع کر کے یہ دعا کریں گے کہ یا اللہ اس کا ثواب فلاں کو پہنچے جس کے ہاں میں نے کھایا پیا ہے۔ اس سارے معاملہ کی اس دوسرے شخص کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔

خود ان مسلم متقی صاحب کی آمدنی ایک قطعی جائز تجارت سے ہوتی ہے جس میں یہ کوئی جھوٹ نہیں بولتے۔ اس کمائی سے اعزہ اور احباب کو کھانے اور چائے کی دعوت اکثر دیتے رہتے ہیں۔ اب ان کی اس پرہیزگاری سے ان کے والدین اور دوسرے اعزہ سخت نالاں ہیں۔ پڑوسیوں میں بھی ایک ہلچل مچ گئی ہے اور بستی میں ان کے خلاف ناراضی پیدا ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے ہمیں

یہ بتائیے کہ یہ متقی صاحب صحیح راستہ پر ہیں یا نہیں؟ ان کی روش قرآن و حدیث کی حدود کے اندر ہے یا متجاوز؟ اور ان کا یہ تقویٰ ٹھوس اصولی ہے یا فروعی یا مستحب؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ انھیں ان کے نفس نے فریب دیا ہو؟

جواب: آپ کا سوال پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ بجائے اس کے کہ آپ کی بستی کے لوگ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ان کے درمیان ایک نیک بندہ ایسا ہے جو خود حلال کی کمائی کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرتا ہے اور اگر دوسرے لوگ حرام رزق یا مشتبہ رزق کھانے والے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس ناپاکی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، نیز بجائے اس کے کہ لوگ اس کی زندگی سے سبق لیتے اور خود اس کے ماں باپ اور رشتہ دار شکر بجالاتے کہ ان کے گھر میں ایسا ایک پرہیزگار فرزند پیدا ہوا ہے، بستی کے لوگ اور ماں باپ اور اقربا الٹے اس سے بگڑتے ہیں اور اس کے متعلق پوچھ رہے ہیں کہ اس کی یہ پرہیزگاری کیسی ہے۔ وہ اگر اعتدال سے زیادہ سختی بھی کر رہا ہے تو اس کی زیادتی نیکی کی طرف ہے نہ کہ برائی کی طرف۔ آپ لوگوں کو اسکی پرہیزگاری کے متعلق پوچھنے کے بجائے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ جو لوگ تجارت جیسے پاک ذریعۂ رزق کو بھی جھوٹ سے ناپاک کر لیتے ہیں اور جو لوگ رشوت اور ظلم اور ایسے ہی دوسرے حرام ذرائع سے روزی حاصل کرتے ہیں ان کی یہ ناپرہیزگاری کیسی ہے! قصوروار کون زیادہ ہے؟ وہ جو ان گندگیوں سے خود بچتا ہے اور دوسروں کو بچانا چاہتا ہے یا وہ جو ان گندگیوں میں خود مبتلا ہوتے ہیں اور بچنے والے کو الٹی ملامت کرتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اخلاقی پستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی بستیوں میں خدا کا قانون توڑنے والے مزے سے دندناتے پھرتے ہیں اور رب العالمین کے قانون کی پابندی کرنے والے اور اس کی اطاعت کی تلقین کرنے والے الٹے نکّو بن جاتے ہیں۔ متعفن فضا میں اگر کہیں سے خوشبو کی ایک ذرا سی لپٹ آ رہی ہو تو تندرست دماغ اسکی طرف لپکتے ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ ساری فضا ہی ایسی ہو جائے۔ لیکن ماتم کے قابل ہے ان بیمار دماغوں کا حال جو خوشبو کی اس لپٹ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فضا میں اتنی سی خوشبو بھی باقی نہ رہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ فضا کی عفونت نے ان دماغوں کو اندر تک سڑا دیا ہے حتیٰ کہ اب ان کے لیے بدبو گوارا ہو گئی ہے اور خوشبو ناگوار۔

مطبوعات

منہاج العربیہ (جزء اول و دوم)۔ مولوی سید نبی صاحب حیدرآبادی، استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

صفحات ۵۶ اور ۸۲۔ قیمت ۸ر اور ۹ر آنے۔ طباعت، کاغذ اعلیٰ اور دیدہ زیب۔

حیدرآباد کے ایک صاحب علم نے عربی مدرسوں اور اسکولوں کے لیے درسی ریڈروں کا یہ سلسلہ لکھا ہے نقل مصری ریڈروں کی کی گئی ہے۔ کتابت بھی نسخ ٹائپ کی، اور مصری کتابوں سے ملتی جلتی ہے۔ مگر افسوس کہ کتاب میں ایسی رکیک اور فاش غلطیاں ہیں جن کے ہوتے ہوئے یہ سلسلہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہو جائے گا۔ یوں تو دونوں حصوں میں شروع سے آخر تک مسامحتوں کی فراوانی ہے، مگر بعض غلطیاں ایسی ہیں جن کی نشان دہی کرنا مناسب ہوگا۔

(i) الدکن (ص ۵ ج ۱) اعلام پر لام تعریف نہیں آتا۔ سوائے ان کلمات کے جہاں اہل زبان سے مسموع ہے جیسے الہند، السند، العراق، الحجاز وغیرہ۔

(ii) یا عزیزْ (ص ۲۱ ج ۱)۔ عزیزُ کو "رفع" ہونا چاہیے۔ ساکن پڑھنا صحیح نہیں۔ اسی طرح نِفِیذْ (ص ۲۲ ج ۱)، کو لِفَـ یَدِیْ لکھنا پڑھنا چاہیے۔ بچے اگر شروع سے وقف کرنا شروع کر دیں گے تو انھیں کبھی صحیح طور پر اعراب دینا آئے ہی گا نہیں۔ (نیز ملاحظہ ہو: ص ۳۹، ۴۰)

(iii) من این انت؟ کے جواب میں انا من المدرسة (ص ۳۱ ج ۱) کہنا مہمل ہے۔ من این انت؟ کے معنی ہیں "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" نیز ملاحظہ ہو (ص ۱۲ ج ۲)۔

(iv) مدینةُ لندنْ (ص ۷ ج ۲) اور مدینةُ حیدرآبادْ (ص ۷ ج ۲) میں لندن اور حیدرآباد کے آخر حرف کو ساکن لکھا گیا ہے۔ حالانکہ ان کو غیر منصرف علامت نصب کے ساتھ لَندَنَ اور حیدرآبادَ لکھنا پڑھنا چاہیے۔

(۷) لا تظلموا علیهم (ص ۶۳ ج ۲) ظلم کا استعمال 'علی' کے ساتھ حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ کاش! جناب مصنف قرآن کریم ہی میں ظلم کے بیسیوں استعمالات پر نظر ڈال لیتے۔ اسی استعمال کا اعادہ ایک دوسری جگہ (ص ۱۰ ج ۲) اس طرح کیا گیا ہے۔ لا یظلم بعضھم علی بعض۔

ایک طرف یہ فروگذاشتیں ہیں، اور دوسری طرف کتاب کا ظاہری طمطراق۔ اللہ کرے دوسرے اڈیشن میں یہ سلسلہ ظاہری خوبیوں کے ساتھ باطنی خوبیوں کا بھی حامل ہو جائے۔ (م-ع)

حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ ضخامت ۱۶ صفحات

قیمت ۳ر ملنے کا پتہ:- ادارہ دعوت الحق، بیگم بازار، کوچہ گھانس منڈی، حیدرآباد (دکن)

یہ ایک مختصر سا خطبہ ہے جس کو مولانا نے مسلمانوں کے کسی جلسہ میں دیا تھا۔ یہ پمفلٹ "بقامت کہتر" ہونے کے باوجود اس لحاظ سے "بقیمت بہتر" ہے کہ اس میں ایک ایسی بڑی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے جو تمام مسلمانوں کا واحد فریضۂ زندگی ہونے کے باعث اس قابل تھی کہ ہر صاحب ایمان اس کی تمنا سے سرشار ہوتا اور اس کے لیے سعی و جستجو میں سرگرداں رہتا، لیکن جو نہایت بے دردی سے فراموش کردی گئی ہے۔

مولانا نے اس خطبہ میں "صراط مستقیم" کی توضیح و تعیین کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حاملین قرآن کو مغضوب اور ضال اقوام کے اتباع سے پوری طرح احتراز کرتے ہوئے چاہیے تھا کہ "اللہ کے محکوم، اس کی شریعت کے عامل اور دنیا میں اس کی شہنشاہیت کے نمایندے بنیں۔ ان کو پہلے اللہ کے قانون کو خود اپنے اوپر اور پھر اس کے بعد دوسروں کے اوپر نافذ کرنا چاہیے۔" مگر افسوس کہ سارے مسلمان انبیاء کو چھوڑ کر چنگیزوں اور ہلاکوؤں کے جانشین بن گئے ہیں، یا بننا چاہتے ہیں۔

مگر مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ اس کار عظیم کے لیے مسلمانوں کو کرنا کیا چاہیے اور کس طرح اس فرض کو انجام دینا چاہیے؟ (ع-ا)

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۸/۰	اسلام اور ضبط ولادت	۱/-
رسالہ دینیات	۱/۸	سود	۲/۸
حقوق الزوجین	۱/۸	اشتراکیت اور نظام اسلام	۳/۸
مسئلہ قومیت	۱/۸		
مسئلہ جبر و قدر	۱/-	نیا نظام تعلیم	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	(زیر طبع)
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴	دین حق	-/۲/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴	اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸	ایک اہم استفتا	-/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/۸	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۱/-
پردہ	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۳/-
تنقیحات	۲/۸	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۲/-
خطبات (نیا ایڈیشن)	۳/-	روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم	۲/-
تفہیمات	۳/۸	روداد اجتماع خواتین	-/۱۲/-
حقیقت توحید	۱/۲	جماعت اسلامی کی دعوت، بناؤ بگاڑ فی	-/۹/-
حقیقت تقویٰ	-/۱۲/-	حقیقت شرک	۲/-

عربی مطبوعات

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-	انسان کا معاشی مسئلہ	۱/-
اسلامی حکومت	۱/-	اسلام اور جاہلیت	۱/-
دین حق	۱/-	شہادت حق	۱/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

۵ الف ذیلدار پارک اچھرہ۔ لاہور (پاکستان)

سرورق مطبوعہ رہبر پریس لاہور